Presented by: Rana Jabir Abbas

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

معنوی آزادی

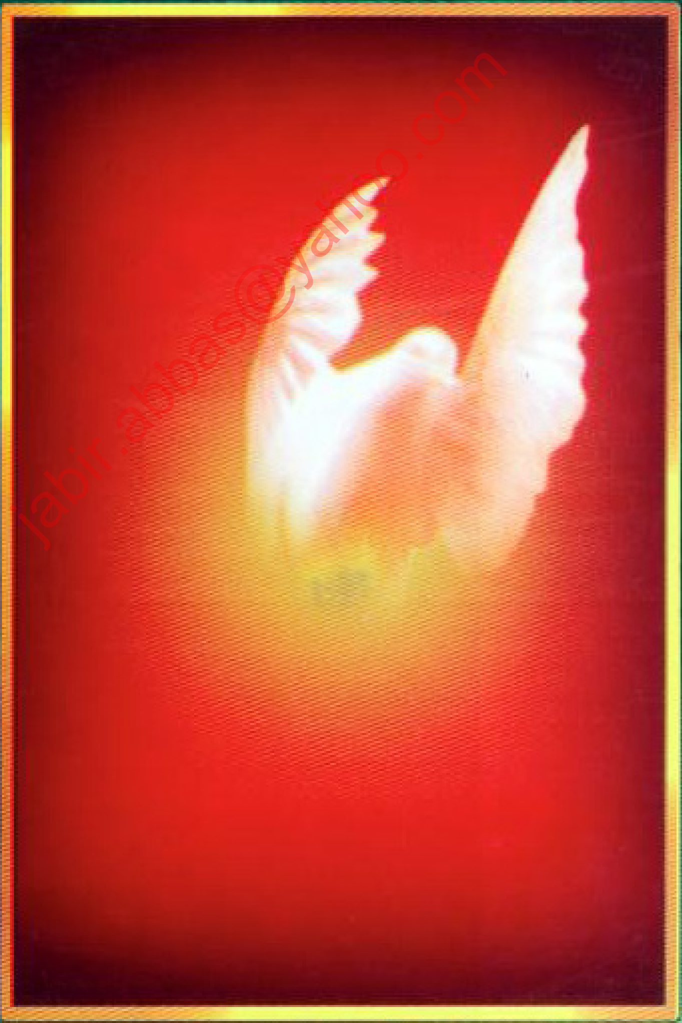

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

معنوی آزادی

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ

سجاد حسین مہدوی
سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ
دارالثقلین
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

DARUSSAQLAIN

P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: معنوی آزادی
مؤلف: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
ترجمہ: سجاد حسین مہدوی، سید سعید حیدر زیدی
ناشر: دارالثقلین
طبع اول: شعبان ۱۴۲۷ھ، ستمبر ۲۰۰۶ء
طبع دوم: ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ، جنوری ۲۰۰۸ء
قیمت: ۶۵ روپے

فہرست

عرض ناشر ــــــــــ ۹
۱۔ معنوی آزادی (۱) ــــــــــ ۱۱
لفظ "مولا" ــــــــــ ۱۳
"آزادی" کے معنی ــــــــــ ۱۴
آزادی کی اقسام ــــــــــ ۱۷
قرآن میں سماجی آزادی ــــــــــ ۱۸
معنوی آزادی ــــــــــ ۲۱
معنوی آزادی سے سماجی آزادی کی وابستگی ــــــــــ ۲۳
حقیقی آزاد مرد ــــــــــ ۲۶
۲۔ معنوی آزادی (۲) ــــــــــ ۳۱
انسان ایک مرکب موجود ہے ــــــــــ ۳۲
دوسرے انسانوں کے لئے روح کی غلامی ــــــــــ ۳۴
مال و دولت کی غلامی ــــــــــ ۳۸

jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسانی اور حیوانی انانیت	۴۱
خود اپنے بارے میں انسان کا فیصلہ	۴۳
ضمیر کی ملامت	۴۷
انسان کا خود اپنے آپ کو سزا دینا	۴۸
معنوی آزادی انبیا کا عظیم ترین دستور عمل	۵۰
۳۔روح کی بزرگی اور بزرگواری	۵۳
علم و دانش کی راہ میں بلند عزم و ارادہ	۵۵
مال و دولت جمع کرنے کے سلسلے میں بلند عزم و ارادہ	۵۶
حصول جاہ و مقام کے لئے بلند عزم و ارادہ	۵۸
بزرگواری	۶۰
کلام پیغمبر	۶۲
حضرت علی کے اقوال	۶۳
صوفیہ کی تعلیمات کا نقصان	۶۸
امام حسین کے کلمات	۷۰
۴۔غیب پر ایمان	۷۷
غیب کے معنی	۷۹
غیب پر ایمان لانے کا راستہ	۸۳
غیب پر ایمان کے معنی	۸۵
غیبی امداد کا ایک قاعدہ ہے	۸۷
آیت اللہ بروجردی کی داستان اور مشہد جانا	۸۸
روشن فکر حضرات میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں بدگمانی	۹۱
روشن مستقبل [illegible] کا نظریہ	۹۳

۵۔معیار انسانیت کیا ہے؟	۹۷
انسان کامل اور انسان ناقص	۹۸
معیار انسانیت کے بارے میں مختلف نظریات	۱۰۰
۱:علم	۱۰۰
۲:اخلاق و عادات	۱۰۱
انسان دوستی	۱۰۳
۳:ارادہ	۱۰۶
۴:آزادی	۱۰۹
۵:فریضہ اور ذمے داری	۱۱۰
۶:زیبائی	۱۱۱
۶۔مکتب انسانیت	۱۱۳
حالیہ صدیوں میں انسانیت کا زوال	۱۱۴
انسانیت کا دوبارہ ظہور اور پیدا ہونے والا تناقض	۱۱۸
صلح کل	۱۲۰
انسان کا حیوان سے بنیادی فرق	۱۲۱
آگوسٹ کانٹ اور ”دین انسانیت“	۱۲۳
انسان کا اختیار اور ذمے داری	۱۲۵
انسان کی سعادت اور لذت	۱۲۷
انسانیت کی اصالت کے بارے میں مکاتیب کے درمیان تضاد	۱۲۹
انسان کی اصالت کا خدا کے ساتھ تعلق	۱۳۳

☆.....☆.....☆

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عرضِ ناشر

jabir.abbas@yahoo.com

مغرب کی مادّی تہذیب اپنی حقیقت کے اعتبار سے کاغذی پھولوں کی مانند ہے' جو اپنی دلفریب رنگارنگی کے باوجود اصلیت اور خوشبو سے محروم ہوتے ہیں۔ اس تہذیب نے انسانیت پر جو ظلم کیے ہیں ان میں سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ انسانی روح کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جس کی بنیاد پر آزادی' حقوقِ انسانی اور عدالتِ اجتماعی جیسے اچھے نعرے بھی صرف کھوکھلے ثابت ہوئے' بلکہ ان ناموں پر اس تہذیب کے پرچارکوں نے انسانیت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے' ہزارہا انسانوں کو تہہ تیغ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زیرِ سایہ انسانوں کو ادھورا انسان بنا کے رکھ دیا۔

زیرِ نظر کتاب استاد شہید مرتضیٰ مطہری علیہ الرحمہ کی تقاریر کا ایک اور مجموعہ ہے۔ ان تقاریر میں شہید مطہری نے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے انسانی روح اور اس میں معنویت کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور موثر انداز میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ جب تک انسانی روح کی تربیت نہ ہو' اس کا رخ خدا کی سمت نہ ہو اور اس میں خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور نہ ہو اس وقت تک اسے اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نے استاد مطہری کی ان تقاریر کو بھی نہایت احتیاط کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ متن میں آیات [illegible] کے اعتبار سے [illegible] کیا جا [illegible] الٰہی کا مصحف

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مفہوم بیان کیا گیا ہے' اس لئے ہم نے عربی عبارت کا مکمل لفظی ترجمہ حاشیہ میں علیحدہ سے لکھ دیا ہے' تا کہ بات سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔ دوران مطالعہ قارئین کو دو طرح کے بریکٹس نظر آئیں گے' اس طرح ( ) کے بریکٹس فارسی متن میں ہی موجود تھے' جبکہ یہ { } بریکٹس عبارت کی وضاحت کے لئے مترجمین نے لگائے ہیں۔

امید ہے یہ کتاب بھی قارئین سے قبولیت کی سند پائے گی۔ پڑھنے والوں کو آراء' تجاویز اور مشورے ہمیں اپنی کارکردگی جانچنے کا موقع فراہم کرتے ہیں' لہٰذا ہم ہمیشہ ان کے منتظر رہتے ہیں۔

والسلام

☆......☆......☆

معنوی آزادی☆

(۱)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰه ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلاۃ و السّلام علٰی عبداللّٰه ورسوله و حبیبه وصفیّه سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد (صلی اللّٰه علیه وآله وسلم) وعلی اٰله الطّیّبین الطّاھرین المعصومین.

اعوذ باللّٰه من الشّیطان الرّجیم.

"قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" (۱)

☆۔ یہ تقریر حسینیہ ارشاد تہران میں ۱۳ رجب ۱۳۸۹ھ کو کی گئی۔

۱۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمے پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں۔ [illegible]

Contact: jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہماری گفتگو کا موضوع ''معنوی آزادی'' ہے۔ آج اس مقدس محفل میں مجموعی طور پر جو باتیں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آزادی کیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ آزادی کی کتنی اقسام ہیں؟

البتہ ہم آزادی کی صرف دو اقسام کے بارے میں ذکر کریں گے: معنوی آزادی اور سماجی آزادی اور پھر تیسرے مرحلے پر آزادی کی ان دونوں اقسام کے باہمی تعلق اور وابستگی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ یعنی اس بارے میں کہ مثلاً معنوی آزادی سماجی آزادی کے بغیر ممکن ہے یا نہیں؟ یا اسکے برعکس سماجی آزادی معنوی آزادی کے بغیر میسّر آسکتی ہے یا نہیں؟

ہماری زیادہ تر گفتگو دوسری قسم کے بارے میں ہوگی۔ یعنی سماجی آزادی کی معنوی آزادی کے ساتھ وابستگی کے بارے میں۔

لفظ ''مولا''

تمہیدی طور پر ہم آج کے دن کی مناسبت سے' کچھ باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں آج کا دن مولائے متقیان علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کا دن ہے' اور ہم نے اسی مناسبت سے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

عرض ہے کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں جو الفاظ بہت کثرت سے استعمال کرتے ہیں' اُن میں سے ایک لفظ ''مولا'' ہے۔ مولائے متقیان' مولیٰ الموالی اور کبھی بطورِ مطلق مولا' مولا نے یہ فرمایا' مولا کے قول کے مطابق وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں اس لفظ کا استعمال پہلی مرتبہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس معروف جملے میں کیا جس کے بارے میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ '' (جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی (جس کا میں نے ہاتھ بلند کیا ہوا ہے) مولا ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۳۳۱)

اس سے آگے بڑھیں تو قرآنِ کریم میں بھی ایک آیت ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا

ہے اور اسکی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ اس آیت میں ارشادِ الٰہی ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱) لیکن جو جملہ ہم نے عرض کیا ہے' وہ رسولِ کریم کی جانب سے واضح نص ہے۔

لفظ مولا کے کیا معنی ہیں؟

آج کی رات ہم لفظ مولا کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ اجمالاً اسی قدر عرض کریں گے کہ اس لفظ کا اصلی مفہوم ''قرب'' اور ''نزدیکی'' ہے۔ ایسی دو چیزوں کے بارے میں لفظ ولا' ولی یا مولا استعمال کیا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے پہلو میں اور ایک دوسرے سے متصل ہوں۔ لہٰذا اکثر دو متضاد معنی میں مستعمل ہے۔ مثلاً خدا کے لئے بندوں کی نسبت سے مولا کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اسکے برعکس بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آقا کے لئے بھی مولا کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور غلام کو بھی مولا کہا جاتا ہے۔ مولا کے ایک اور معنی' جو ہمارے مقصود ہیں ''مُعتِق'' یعنی آزاد کرنے والا ہیں۔ ایسا شخص جو آزاد ہوتا ہے اسے ''مُعتَق'' کہتے ہیں۔ لفظ مولا کا اطلاق ''مُعتِق'' پر بھی ہوتا ہے اور ''مُعتَق'' پر بھی۔ یعنی آزاد کرنے والے کو بھی مولا کہتے ہیں اور آزاد ہونے والے کو بھی مولا کہا جاتا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ '' سے کیا مراد ہے؟ مولا کے کونسے معنی مراد ہیں؟

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہاں ہمارے عقیدے کے لحاظ سے اسکے کونسے معنی درست ہیں۔ لیکن اپنی بحث کی مناسبت سے عرض کرتے ہیں کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور ایک خاص ذوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولا کے معنی ''مُعتِق'' یعنی آزادی بخشنے والا لئے ہیں۔ ظاہراً مثنوی کے دفترِ ششم میں ہے' ایک معروف داستان ہے' خیانت کار قاضی اور عورت کی داستان۔ قاضی صندوق میں چھپنا چاہتا ہے' اُسے صندوق میں چھپا دیتے ہیں۔ پھر یہ صندوق

۱۔ یاد رکھو کہ اللہ اس کا مولا ہے اور جبرئیل اور نیک مومنین۔ (سورۂ تحریم۔ آیت ۴)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

ایک مزدور کے حوالے کر دیتے ہیں۔ راستے میں قاضی اس مزدور سے التماس کرتا ہے کہ میں تجھے منہ مانگا انعام دوں گا' تو جا اور میرے معاون کو خبر کر دے کہ وہ آ کر اس صندوق کو خرید لے۔ اگلے معاون کو خبر کی جاتی ہے' وہ آتا ہے' صندوق خریدتا ہے اور قاضی کو آزاد کراتا ہے۔ اس مقام سے مولانا روم مضمون بدلتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم سب تن کی شہوت کے صندوق میں بند ہیں لیکن اپنی اس حالت کا ہمیں خود بھی پتا نہیں ہوتا۔ ہمیں آزاد کرانے والے ایک شخص کی ضرورت ہے' جو ہمیں نفس اور تن کی شہوت کے اس صندوق سے آزاد کرائے۔ انبیاء ہمیں آزاد کرانے والے اور نجات دہندہ ہیں۔ پھر کہتے ہیں۔

زین سبب پیغمبر با اجتہاد — نام خود و ان علی مولا نہاد

گفت ہر کس را منم مولا و دوست — ابن عم من علی مولای اوست

کیست مولا؟ آنکہ آزادت کند — بند رقیت زپایت برکند

جی ہاں' واقعاً یہ ایک حقیقت ہے۔ یعنی قطع نظر اس کے کہ "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ" کے معنی یہی ہوں یا نہ ہوں۔ یعنی نبی کریم نے خود اپنے آپ کو اور حضرت علی کو جو مولا کہا ہے' تو یہ آزادی بخشنے کے اعتبار سے ہو یا نہ ہو' لیکن یہ خود ایک حقیقت ہے کہ ہر سچا نبی لوگوں کو آزادی عطا کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہے اور ہر امامِ حق کی خصوصیت بھی یہی ہے۔

"آزادی" کے معنی

اب دیکھتے ہیں کہ آزادی کے کیا معنی ہیں؟ یہ آزادی اور آزادگی جس کا ذکر ہوتا ہے' اس سے کیا مراد ہے؟

آزادی زندگی اور ارتقا کے لوازمات میں سے ہے۔ یعنی ہر زندہ موجود کی ایک ضرورت آزادی ہے۔ فرق نہیں پڑتا کہ یہ زندہ موجود نبات میں سے ہو یا حیوان میں سے یا انسان ہو' بہر

۱۔ اسی بنا پر پیغمبر نے اپنے آپ کو اور علی کو مولا کہا اور فرمایا کہ جس کا میں مولا اور دوست ہوں' میرا چچازاد بھائی علی بھی اس کا مولا ہے۔ مولا کون ہے؟ جو تمہیں آزادی دلائے' تمہارے پیروں سے غلامی کی زنجیر کاٹے۔

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صورت آزادی کا محتاج ہے۔

البتہ نبات کی آزادی اُن کی ساخت کی مناسبت سے ہوتی ہے' حیوان کی آزادی دوسری قسم کی ہوتی ہے' جبکہ انسان نبات اور حیوان کی آزادیوں سے ماوراء دوسری آزادیوں کا محتاج ہوتا ہے۔

ہر زندہ موجود کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ رشد و نمو پاتا ہے' ارتقا کی جانب گامزن ہوتا ہے' متوقف اور منجمد نہیں ہوتا' ایک ہی حالت میں پڑا نہیں رہتا۔

جمادات' جن میں نمو اور ارتقا نہیں ہوتا' انہیں آزادی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جمادات کے لئے آزادی کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہوتا' لیکن نباتات کے لئے آزادی لازم ہے۔ زندہ موجودات کو اپنی نمو اور ارتقا کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: تربیت' تحفظ اور آزادی۔

تربیت عوامل و اسباب کے ایک ایسے سلسلے کا نام ہے' جس کی زندہ موجودات کو اپنی نشو و نما کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نبات کو اپنی نشو و نما کے لئے مٹی اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے' روشنی اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک حیوان کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے' اور ایک انسان کو نبات اور حیوان کے لئے ضروری تمام چیزوں کے علاوہ مزید چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو سب کی سب تعلیم و تربیت کی اصطلاح میں شامل ہیں۔

یہ عوامل اُن غذاؤں کی مانند ہیں جنہیں ایک زندہ موجود تک پہنچنا چاہئے' تاکہ وہ نشو و نما پا سکے۔ اس بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زندہ موجود بغیر غذا کے نشو و نما پا سکتا ہے۔ زندہ موجود کی زندگی کی ایک ضرورت قوہ غاذیہ (۱) ہے۔

زندہ موجود کی دوسری ضرورت تحفظ ہے۔

تحفظ (security) کیا چیز ہے؟

۱۔ وہ قوت جو غذا کو تحلیل کر کے اسے جسم کا حصہ بناتی ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

یعنی کچھ چیزیں زندہ موجود کے اختیار میں ہوتی ہیں؟ وہ حیات رکھتا ہے' حیات کے لوازم اور ضروریات بھی اسکے پاس ہوتی ہیں' اسے تحفظ حاصل ہونا چاہئے' تا کہ جو کچھ اسکے پاس ہے کوئی دوسرا اسے اس سے چھین نہ لے۔ یعنی کوئی دشمن' کوئی بیرونی قوت اسے حاصل چیزیں چھین نہ لے۔

ہم انسان کو سامنے رکھتے ہیں۔ انسان کو تعلیم وتربیت کی ضرورت بھی ہوتی ہے تحفظ کی بھی۔ یعنی وہ جان رکھتا ہے' اس سے اسکی جان نہ چھین لیں۔ دولت رکھتا ہے' اس سے اسکی دولت نہ ہتھیالیں۔ صحت رکھتا ہے' اس سے اسکی صحت نہ چھین لیں۔ جو کچھ اسکے پاس ہے' اسے اس سے محروم نہ کر دیں۔

تیسری چیز جس کی ہر زندہ موجود کو ضرورت ہے' وہ آزادی ہے۔

آزادی یعنی کیا؟

یعنی اُس کا راستہ نہ روکیں' اسکے سامنے رکاوٹ کھڑی نہ کریں۔

ممکن ہے ایک زندہ موجود کو تحفظ (security) حاصل ہو' نشوونما کے عوامل بھی رکھتا ہو لیکن عین اسی وقت اسکی نشوونما میں رکاوٹ حائل کر دی جائے۔

فرض کیجئے آپ ایک پودے کی نشوونما چاہتے ہیں۔ لہٰذا دوسری تمام شرائط کے ساتھ ساتھ اس کی نشوونما کے لئے ماحول بھی سازگار ہو' یعنی کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو' کوئی ایسی چیز حائل نہ ہو جو اسکے رشد ونمو کا راستہ روک لے۔ مثلاً ایک درخت اس وقت بڑھے گا جب اسکے سامنے کھلی فضا ہو۔ اگر آپ ایک پودا زمین میں بو دیں' جبکہ اسکے اوپر ایک بڑی چھت ہو تو خواہ یہ پودا چنار کا پودا ہو' اسکے باوجود اسکی نشوونما کا کوئی امکان نہیں۔

ہر زندہ موجود' جو نشوونما اور ارتقا کا راستہ طے کرنا چاہتا ہے' اُسکی ایک ضرورت آزادی ہے۔

پس آزادی یعنی کیا؟

یعنی رکاوٹ کا نہ ہونا۔ آزاد انسان' وہ انسان ہوتے ہیں جو اپنی نمو اور ارتقا کی راہ میں حائل رکاوٹوں [illegible] ہیں۔ وہ ایسے انسان ہوتے ہیں جو رکاوٹوں کے سامنے گھٹنے نہیں

ٹیک دیتے۔

یہ تو تھی آزادی کی ایک مختصر تعریف' اب نوبت ہے آزادی کی اقسام کے بیان کی۔

آزادی کی اقسام

انسان جو ایک خاص قسم کا موجود ہے اور اسکی زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی انفرادی زندگی میں ایک ارتقا یافتہ موجود ہے اور نبات وحیوان سے بہت مختلف ہے۔ جن آزادیوں کی نباتات اور حیوانات کو ضرورت ہے' انسان کی ان کے علاوہ بھی کچھ ضروریات ہیں' جنہیں ہم دو اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم سماجی آزادی ہے۔

سماجی آزادی کے کیا معنی ہیں؟

اسکے معنی ہیں کہ انسان کو معاشرے میں' دوسرے افراد معاشرہ کی طرف سے آزادی حاصل ہو' دوسرے اسکے نمو اور ارتقا کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں' اسے محبوس نہ کریں' اسے ایک ایسا قیدی نہ بنا دیں جس کی فعالیت اور سرگرمیوں کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں' دوسرے اُس کا استحصال (exploitation) نہ کریں' اسے اپنا خادم نہ بنالیں' غلام نہ بنا ڈالیں۔ یعنی اسکی تمام فکری اور جسمی قوتوں کو صرف اپنے منافع اور مفاد کے لئے استعمال نہ کریں۔

اسے کہتے ہیں سماجی آزادی۔

خود سماجی آزادی کی بھی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں' جن سے فی الحال ہمیں سروکار نہیں ہے۔ پس آزادی کی اقسام میں سے ایک قسم سماجی آزادی ہے۔ یعنی انسان دوسرے لوگوں کی طرف سے آزاد ہو۔

تاریخ کے طویل ادوار میں انسانی زندگی کی ایک مشکل یہی رہی ہے کہ طاقتور اور قدرتمند افراد نے اپنی طاقت وقوت سے غلط فائدہ اٹھایا اور دوسرے افراد کو اپنی خدمت پر لگا لیا' انہیں اپنے غلاموں کی طرح بنا لیا اور ان کی محنت کا ثمر جو خود اُن کے لئے ہونا چاہئے تھا' اُسے اُن سے ہتھیالیا۔

آپ لفظ استعمار کے معنی جانتے ہیں؟

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

استعمار یعنی دوسروں کا پھل اچک لینا۔ ہر انسان کا وجود پھلوں سے لدے ایک درخت کی مانند ہے۔ ہر انسان کے وجود کا پھل یعنی اسکی فکر و عمل کا ماحصل' اسکی سرگرمیوں کا حاصل' اسکے ہنر کا محصول خود اسکی ملکیت ہونا چاہئے۔ جب کچھ افراد دوسروں کے وجود کے درخت کا پھل اپنی ملکیت بنا لینے کا کام کرتے ہیں' اور اُن کے وجود کا پھل ہتھیا لیتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ انہوں نے اُن دوسرے انسانوں کا استعمار کیا ہے۔

تاریخ بشر میں انسانوں کی مشکلات و مسائل میں سے ایک مشکل یہی رہی ہے کہ ایک فرد نے دوسرے فرد کا' ایک قوم نے دوسری قوم کا استعمار کیا ہے' اسے اپنی غلامی میں لیا ہے۔ یا کم از کم یہ کیا ہے کہ اپنے لئے میدان کھلا رکھنے کی خاطر دوسرے سے میدان چھین لیا ہے' اُس کا استعمار نہیں کیا لیکن اسکے میدان پر قبضہ کر لیا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے ایک قطعۂ زمین دو افراد کی مشترک ملکیت ہے' دونوں اس زمین سے استفادہ کرتے ہیں' اُن دونوں میں سے جو شخص قوی اور طاقتور ہوتا ہے وہ اپنی زمین کو توسیع دینے کے لئے دوسرے کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے اور اسے زمین سے بے دخل کر دیتا ہے' یا اُسے زمین سمیت اپنی خدمت پر مامور کر لیتا ہے' جسے اسارت اور غلامی کہتے ہیں۔

قرآن میں سماجی آزادی

قرآن مجید کی نص کے مطابق انبیا کے مقاصد میں سے ایک مقصد انسانوں کو سماجی آزادی فراہم کرنا ہے۔ یعنی انسانوں کو ایک دوسرے کی قید' بندگی اور غلامی سے نجات دلانا۔ قرآن کریم ایک حیرت انگیز کتاب ہے!! بعض معانی و مفاہیم ایسے ہیں جو ایک زمانے میں کھل اٹھتے ہیں' زندہ ہوتے ہیں' رفعت و بلندی حاصل کرتے ہیں' لیکن اگر دوسرے زمانوں میں انہیں دیکھا جائے تو انہیں اس قدر بلندی حاصل نہیں ہوتی۔ بعض ادوار میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض کلمات بجا طور پر رفعت پاتے ہیں۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں یہ کلمہ کس قدر شان اور بلندی کا حامل ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے۔ قرآن کے ولولہ انگیز پیغاموں میں سے ایک پیغام یہی "سماجی آزادی" ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس بارے میں جس قدر زندہ اور ولولہ انگیز جملہ قرآن کریم میں آیا ہے ویسا جملہ آپ کہیں اور سے نہیں لا سکتے' آپ کسی بھی زمانے میں نہیں پا سکتے' نہ اٹھارویں صدی میں' نہ انیسویں صدی میں اور نہ بیسویں صدی میں۔ جبکہ ان صدیوں میں فلاسفۂ آزادی بشر کا نعرہ لگاتے ہیں' اور آزادی کا لفظ حد سے زیادہ زبان زد عام ہے اور ایک نعرے کی صورت میں ڈھل چکا ہے۔

آپ ایک ایسا جملہ لائیے جو اس جملے سے زیادہ زندہ اور ولولہ انگیز ہو جو قرآن میں موجود ہے کہ:

"قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ." (۱)

اے پیغمبر! یہ لوگ جو کسی ایک گزشتہ آسمانی کتاب کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں' ان یہودیوں' ان زرتشتیوں (اور حتیٰ شاید ان صابئین' جن کا نام قرآن میں آیا ہے) اور وہ تمام اقوام جو کسی ایک آسمانی کتاب کی پیروکار ہیں' اُن سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم سب ایک کلمے کے گرد ایک پرچم کے تلے جمع ہو جائیں۔ وہ پرچم کیا ہے؟ {اس بارے میں} صرف دو جملے کہے گئے ہیں' ایک جملہ یہ ہے کہ "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا" عبادت کے موقع پر' خدائے یگانہ کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں' نہ حضرت عیسیٰ کی پرستش کریں' نہ ان کے سوا کسی اور کی' اور نہ اہرمن کی۔ خدا کے سوا کسی موجود کی پرستش نہ کریں۔

دوسرا جملہ ہے " وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ." یعنی ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کو اپنا غلام اور بندہ نہ سمجھے اور کوئی بھی کسی دوسرے شخص کو اپنا ارباب اور آقا قرار نہ دے۔ یعنی آقائی اور نوکری کا نظام منسوخ' استعمار' مستعمر اور مستعمر کا نظام منسوخ۔ عدم

ا۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمے پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں' آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں ... [illegible]

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

مساوات کا نظام منسوخ۔ کسی کو کسی پر استعمار اور استعباد (اسے بندہ اور غلام بنانے) کا حق نہیں۔

صرف یہی ایک آیت نہیں' اس بارے میں قرآن کریم میں بکثرت آیات موجود ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی عرائض کو اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں' اس لئے ان میں سے صرف چند آیات پیش کریں گے:

قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل کرتا ہے کہ جب انہوں نے فرعون سے مباحثہ کیا اور فرعون نے ان سے کہا کہ: اَلَمْ نُرَبِّکَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّ لَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِکَ سِنِیْنَ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (۱) تو حضرت موسیٰ نے اس سے کہا: وَ تِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ. (۲)

فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا: تم وہی ہو جو ہمارے گھر میں پلے بڑھے' ہماری روٹی کھا کر بڑے ہوئے۔ تم وہی ہو جو بڑے ہونے کے بعد اس جرم کے مرتکب ہوئے (فرعون کے الفاظ میں) تم نے ایک انسان کو قتل کیا۔

اس طرح فرعون حضرت موسیٰ پر احسان جتانا چاہتا تھا کہ تم ہمارے گھر میں پلے بڑھے ہو' تم نے تو ہمارے دسترخوان کی روٹیاں کھائی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا: یہ بھی کوئی بات ہوئی؟! بے شک میں تیرے گھر میں پلا بڑھا ہوں' لیکن کیا تیرے گھر میں پل کر بڑا ہونے کی وجہ سے میں تجھے اپنی قوم کو غلام بناتا دیکھوں اور خاموش رہوں؟ نہیں' میں ان لوگوں کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے آیا ہوں۔

مرحوم آیت اللہ نائینی کتاب "تنزیہ الامۃ" میں فرماتے ہیں کہ سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی قوم' اولاد یعقوب نے قبطیوں کی مانند فرعون کی پرستش نہیں کی تھی' لیکن کیونکہ فرعون

۱۔ کیا ہم نے تمہیں بچپنے میں پالا نہیں ہے اور کیا تم نے ہمارے درمیان اپنی عمر کے کئی سال نہیں گزارے ہیں' اور تم نے وہ کام کیا ہے جو تم کر گئے ہو اور تم شکریہ ادا کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔ (سورہ شعراء ۲۶۔ آیات ۱۸'۱۹)

۲۔ یہ احسان جو تو (میری) تربیت کے سلسلے میں جتا رہا ہے تو تو نے یہ غضب کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔

نے انہیں غلاموں کی مانند اپنی خدمت پر مامور کیا ہوا تھا' لہٰذا قرآن کریم نے اس بات کو لفظ "تعبید" کے ذریعے حضرت موسیٰ کی زبان سے نقل کیا ہے۔

بطور کلی اور قطعی طور پر انبیا کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ سماجی آزادی فراہم کریں اور مختلف معاشرتی بندگیوں' غلامیوں اور معاشرے میں آزادی سلب کرنے کے مختلف مظاہر کے خلاف جنگ کریں۔ آج کی دنیا بھی "سماجی آزادی" کو اپنی مقدس اور قابل احترام چیزوں میں سے شمار کرتی ہے۔ اگر آپ اعلامیہ حقوق بشر کے مقدمے کا مطالعہ کریں' تو بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ: دنیا میں وجود میں آنے والی تمام جنگوں' خونریزیوں اور بدبختیوں کی علت و علل یہ ہے کہ افراد بشر ایک دوسرے کی آزادی کا احترام نہیں کرتے۔

کیا یہاں تک انبیا کی منطق اور عصر حاضر کی منطق میں اتفاق پایا جاتا ہے؟

کیا آزادی مقدس چیز ہے؟

جی ہاں آزادی مقدس ہے اور انتہائی مقدس ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک جملہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ متواتر بھی ہے۔ فرماتے ہیں: اِذَا بَلَغَ بَنُوْ اَبِی الْعَاصِ ثَلَاثِیْنَ اِتَّخَذُوْا عِبَادَ اللهِ خَوَلًا وَّمَالَ اللهِ دُوَلًا وَّدِیْنَ اللهِ دَخَلًا۔ (۱) پیغمبر اسلام ہمیشہ امویوں کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے تھے اور امت کے مستقبل کے حوالے سے ان کی طرف سے پریشان رہتے تھے۔ فرماتے تھے: جب اولاد ابوالعاص کی تعداد تیس تک ہو جائے گی' تو وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ اور خدا کے مال کو اپنا مال سمجھے گی اور دین خدا میں بھی من مانی بدعتیں ایجاد کرے گی۔

پس یہ بات بھی درست ہے کہ سماجی آزادی مقدس ہے۔ لیکن آزادی کی ایک اور قسم معنوی آزادی ہے۔

معنوی آزادی

انبیا کے مکتب اور انسانوں کے بنائے ہوئے مکاتیب کے درمیان فرق یہ ہے کہ انبیا اس

۱۔ مجمع البحرین طریحی

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

لئے آئے ہیں تا کہ انسانوں کو سماجی آزادی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں معنوی آزادی بھی عطا کریں۔ معنوی آزادی کو ہر دوسری چیز سے زیادہ قدر و اہمیت حاصل ہے۔ صرف سماجی آزادی مقدس نہیں ہے' بلکہ معنوی آزادی بھی مقدس ہے۔ اور سماجی آزادی' بغیر معنوی آزادی کے میسر اور عملی نہیں ہو سکتی۔

دور حاضر کے انسانی معاشروں کا مسئلہ یہی ہے کہ آج کا انسان یہ تو چاہتا ہے کہ سماجی آزادی فراہم کرے' لیکن معنوی آزادی کے حصول کی کوشش نہیں کرتا۔ یعنی اس میں اس کی قدرت و صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ معنوی آزادی کو نبوت' انبیاء' دین' ایمان اور آسمانی کتابوں کے سوا کسی اور طریقے سے فراہم کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اب دیکھتے ہیں کہ معنوی آزادی کے کیا معنی ہیں؟

انسان ایک مرکب وجود اور مختلف قویٰ اور جبلتوں (instincts) کا مالک ہے۔ انسان کے وجود میں ہزاروں طاقتور قویٰ پائے جاتے ہیں۔ انسان میں شہوت ہوتی ہے' غضب اور غصہ ہوتا ہے' حرص و طمع ہوتی ہے' جاہ طلبی اور زیادہ طلبی ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ عقل کا مالک بھی ہوتا ہے' فطرت رکھتا ہے' اخلاقی وجدان کا حامل ہوتا ہے۔

ممکن ہے انسان معنوی لحاظ سے' باطنی لحاظ سے اور اپنی روح کے اعتبار سے ایک آزاد مرد ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک غلام فرد۔ یعنی ممکن ہے کہ انسان اپنی حرص کا بندہ ہو' اپنی شہوت کا غلام ہو' اپنے غصے کا اسیر ہو' زیادہ طلبی نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہو اور ممکن ہے ان سب چیزوں سے آزاد ہو۔

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلشادم بندۂ عشقم واز هر دو جہان آزادم(۱)

ممکن ہے ایک انسان جس طرح سماجی اعتبار سے ایک آزاد مرد ہو' کسی ذلت کے سامنے سر نہ جھکاتا ہو' غلامی قبول نہ کرتا ہو اور معاشرے میں اپنی آزادی کی حفاظت کرتا ہو' اسی طرح

۱۔ صاف [illegible] کہ میں عشق کا غلام اور دو جہاں سے آزاد ہوں۔

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اخلاق اور معنویت کے اعتبار سے بھی اپنی آزادی کا تحفظ کرتا ہو۔ یعنی اپنے ضمیر اور فکر کو آزاد رکھتا ہو۔ یہ آزادی وہی چیز ہے جسے دین کی زبان میں "تزکیۂ نفس" اور "تقویٰ" کہا جاتا ہے۔

معنوی آزادی سے سماجی آزادی کی وابستگی

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان سماجی آزادی کا مالک تو ہو لیکن معنوی آزادی نہ رکھتا ہو؟ یعنی انسان خود اپنی شہوت' غضب' حرص و طمع کا اسیر ہو لیکن اس کے باوجود دوسروں کی آزادی کا احترام کرتا ہو؟

آج عملاً اسکا جواب اثبات میں دیا جاتا ہے۔ عملاً چاہتے ہیں کہ انسان اپنے طمع و لالچ' شہوت اور غضب کا غلام رہے' اپنے نفس امارہ کا قیدی رہے اور اسی حال میں وہی انسان جو خود اپنا اسیر اور قیدی ہے سماجی آزادی کو محترم سمجھے۔ یہ اجتماع ضدین کی ایک مثال ہے۔ آج کے انسانی معاشرے کا ایک تضاد یہی ہے۔

قدیم زمانے کا انسان آزادی کو محترم نہیں سمجھتا تھا' آزادی کو پامال کیا کرتا تھا۔

ٹھیک ہے' لیکن کیوں پامال کرتا تھا؟

کیا وہ نادان تھا اس لئے دوسروں کی آزادی سلب کیا کرتا تھا اور اب جبکہ انسان دانا ہو چکا ہے تو اس کا یہ دانا اور صاحب شعور ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ دوسروں کی آزادی کا احترام کرے گا؟

مثلاً بیماریوں کے بارے میں ایسا ہے۔ قدیم انسان جاہل و نادان تھا' اس لئے جب بیماریوں کا سامنا کرتا تھا تو اپنی تعیین کردہ مخصوص دواؤں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کر پاتا تھا۔ لیکن آج کیونکہ انسان دانا ہو چکا ہے' اسلئے کافی ہے کہ علاج کے اس قدیم طریقے کو دور اٹھا کر پھینک دے اور اسکی جگہ نیا علاج لے آئے۔

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ قدیم انسان جو دوسروں کی آزادی سلب کرتا تھا' تو اسکی وجہ کیا یہ تھی کہ وہ لاعلم تھا؟ اپنی نادانی کی بنا پر آزادی سلب کیا کرتا تھا؟

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

نہیں' نادانی اور دانائی اس عمل میں اثر نہیں رکھتی تھی۔ وہ جانتے بوجھتے (دوسروں کی آزادی) سلب کیا کرتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہی اسکے مفاد میں ہے۔

قدیم انسان جو دوسروں کی آزادی اور حقوق کو محترم نہیں سمجھتا تھا' تو کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے قوانین اس انداز سے وضع کئے گئے تھے' اب جوں ہی قانون بدلے گا معاملہ پھر درست ہو جائے گا؟ ان طے کردہ قوانین کی طرح جو انسان بناتا ہے۔ مثلاً امریکہ میں کہتے ہیں غلامی کا قانون منسوخ ہو گیا ہے۔ وہاں غلامی کا قانون منسوخ ہوتے ہی کیا واقعی غلامی ختم ہو گئی ہے؟ یا اسکی شکل اور صورت بدل گئی ہے' اصل اپنی جگہ باقی ہے۔

قدیم انسان' جو آزادی اور حقوق کا احترام نہیں کرتا تھا' کیا اسکی وجہ اس کا فلسفی طرز تفکر تھا؟ ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی' صرف ایک چیز تھی اور وہ تھی مفاد پرستی۔

قدیم انسان' اپنی انفرادی طبیعت کے تحت مفاد پرست تھا' اپنے ذاتی فائدے کی فکر میں رہتا تھا' ہر وسیلے اور ذریعے کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک وسیلہ اور ذریعہ خود افراد بشر تھے۔ جس طرح وہ لکڑی' پتھر' لوہے' مویشی' گائے' گھوڑے' خچر کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا' اسی طرح انسان کو بھی اپنے فائدے کے لئے کام میں لانا چاہتا تھا۔

جب انسان کسی درخت کو بوتا ہے یا کاٹتا ہے' تو اسے اس درخت کی کوئی فکر نہیں ہوتی' وہ صرف اپنے فائدے کے بارے میں سوچتا ہے۔ جب وہ کسی مویشی کو پال پوس کر موٹا تازہ کرتا ہے اور پھر اسے ذبح کر دیتا ہے' تو اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وہ سوائے اپنے منافع کے کسی اور چیز کو مدنظر نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب انسان دوسرے افراد کو اپنا غلام بناتا ہے' اُن کے حقوق سلب کرتا ہے' تو اسکی وجہ صرف اپنی منفعت طلبی اور مفاد پرستی ہوتی ہے۔

پس وہ سبب جو ماضی میں انسان کو سماجی آزادی سلب کرنے اور دوسروں کے سماجی حقوق پامال کرنے پر ابھارتا تھا' وہ اس میں پائی جانے والی مفاد پرستی کی حس تھی اور بس۔

آج کے دور کے انسان میں مفاد پرستی کی حس کا کیا حال ہے؟ اس میں یہ حس پائی جاتی ہے یا نہیں؟

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جی ہاں پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ ہڑپ کر جانے کے لئے جتنا گزشتہ زمانے کے انسان کا منہ کھلتا تھا' آج کے دور کے انسان کا منہ بھی اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں کھلتا۔

یہ علم اور نہ قوانین کی تبدیلی طمع اور لالچ کا راستہ روک سکے ہیں۔ ان چیزوں نے صرف اتنا کام کیا ہے کہ مسئلے کی شکل وصورت کو بدل دیا ہے' اصل مسئلہ جوں کا توں باقی ہے۔ ایک پردہ' ایک خوش رنگ غلاف اسکے اوپر چڑھا دیا گیا ہے۔

قدیم زمانے کا انسان بے باک ہوا کرتا تھا' ابھی اسے نفاق اور دورخی کی ہوا نہیں لگی تھی۔ فرعون لوگوں کو غلام بناتا تھا' اور باقاعدہ کہتا تھا کہ: وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۱) موسیٰ! کیا کہتے ہو؟ یہ میرے بندے ہیں' میرے غلام ہیں۔ اُس نے اپنے استعمار اور استعباد پر کوئی نقاب نہیں ڈالا ہوا تھا۔ لیکن آج کا انسان آزاد دنیا' امن وآشتی اور آزادی کے تحفظ کے نام پر تمام آزادیاں اور حقوق سلب کرتا ہے' اور لوگوں کو بندہ' غلام اور قیدی بناتا ہے۔

اس طرز عمل کی وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ معنوی آزادی کا حامل نہیں' اپنی روح کی طرف سے آزاد نہیں' کیونکہ تقویٰ کا مالک نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کا ایک جملہ ہے' جو آپ کے دوسرے تمام جملوں کی مانند قیمتی ہے۔ یہ تقویٰ کے بارے میں ہے' جو آج کل بعض لوگوں کی نظر میں ایک فرسودہ موضوع ہو چکا ہے! فرماتے ہیں: اِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ مِفْتَاحُ سَدَادٍ وَ ذَخِيرَةُ مَعَادٍ وَعِتْقٌ مِنْ كُلِّ مَلَكَةٍ وَ نَجَاةٌ مِنْ كُلِّ هَلَكَةٍ (۲) خدا کا خوف ہر راہ راست کی کنجی ہے۔ تقویٰ کے بغیر انسان راہ راست پر قدم نہیں بڑھا سکتا' وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ جس انسان کے پاس تقویٰ نہ ہو وہ آخرت

۱۔ ان کی قوم خود ہماری پرستش کر رہی ہے۔ (سورہ مومنون ۲۳۔ آیت ۴۷)

۲۔ بے شک اللہ کا خوف (تقویٰ) ہدایت کی کلید اور آخرت کا ذخیرہ ہے اور ہر غلامی سے آزادی اور ہر تباہی سے نجات کا ذریعہ ہے۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے لئے کوئی سرمایہ نہیں رکھتا' تقویٰ کے بغیر انسان آزاد نہیں ہوتا' "وَعِتْقٌ مِنْ كُلِّ مَلَكَةٍ" تقویٰ ہی ہے جو انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

حقیقی آزاد مرد

انسان کو خود اپنے وجود کی طرف سے' اپنی روح کی جانب سے آزاد ہونا چاہئے' تاکہ دوسروں کو آزادی فراہم کر سکے۔ لہٰذا حقیقی معنوں میں دنیا کا مرد حر کون ہے؟ علی ابن ابی طالب' یا وہ افراد جو علی کے طبقے سے ہیں' یا ان کے دبستان (school of thought) اور مکتب کے تربیت شدہ ہیں۔ کیونکہ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے پہلے مرحلے میں اپنے نفس کی قید سے نجات حاصل کی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"أَأَقْنَعُ مِنْ نَفْسِي بِأَنْ يُقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ؟" (۱)

"وَكَيْفَ أَظْلِمُ أَحَداً لِنَفْسٍ يُسْرِعُ إِلَى الْبِلَى قُفُولُهَا وَ يَطُولُ فِي الثَّرَى حُلُولُهَا." (۲)

درحقیقت ایسا ہی شخص آزاد اور آزادی بخش ہو سکتا ہے جو ہمیشہ علی کی مانند رہے' یا کم از کم ان کا پیروکار رہے' اپنے نفس کا احتساب کرتا ہو' اپنی روح کا محاسبہ کرتا ہو' محراب عبادت میں تنہا بیٹھ کر اپنی ریش کو ہاتھ میں لیتا اور کہتا ہو کہ: يَا دُنْيَا! غُرِّي غَيْرِي. (۳) اے دنیا کے سونا چاندی' اے دنیا کے مال و منال' جا علی کے سوا کسی اور کو فریب دے' میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں۔

ایسا ہی شخص' منافقت اور دورخے پن سے نہیں' بلکہ صدق دل کے ساتھ لوگوں کی آزادی

۱۔ کیا میں اس بات میں مگن رہوں کہ مجھے امیرالمومنین کہا جاتا ہے۔ (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۵)

۲۔ میں اس نفس کی خاطر کیونکر کسی پر ظلم کر سکتا ہوں جو جلد ہی فنا کی طرف پلٹنے والا اور مدتوں تک مٹی کے نیچے پڑا رہنے والا ہے۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۱)

۳۔ (اے دنیا!) [illegible] (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۷۷)

http://fb.com/ranajabirabbas

اور ان کے حقوق کے احترام کا قائل ہو سکتا ہے' جس کے ضمیر' جس کے وجدان میں ایک آسمانی ندا موجود ہو اور اسے پکار رہی ہو۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ ایک ایسا شخص جو ایسا تقویٰ رکھتا ہو' ایسی معنویت کا مالک ہو' ایسے خوف خدا کا حامل ہو جب لوگوں کا حکمران بنتا ہے اور لوگ اسکے محکوم ہوتے ہیں' تو جس احساس سے وہ عاری ہوتا ہے وہ یہی حاکم اور محکوم کا احساس ہے۔ لوگ سابقہ سوچ کی بنیاد پر از خود اس سے فاصلے پر رہنا چاہتے ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ فاصلہ نہ رکھو' میرے قریب آؤ۔ جب جنگ صفین کو جاتے یا اس سے پلٹتے وقت "انبار" نامی شہر سے گزرتے ہیں (جو اس وقت عراق کے شہروں میں سے ایک شہر ہے اور ایران کے قدیم شہروں میں سے تھا اور وہاں ایرانی رہتے تھے) تو وہاں چند زمیندار' سردار' بزرگ افراد خلیفہ کے استقبال کو آتے ہیں' وہ اپنے خیال میں حضرت علی کو ساسانی سلاطین کا جانشین سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ جب حضرت کے قریب پہنچتے ہیں تو امام کی سواری کے آگے آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت علی انہیں آواز دے کر پوچھتے ہیں: ایسا کیوں کر رہے ہو؟ وہ کہتے ہیں: آقا! اس طریقے سے ہم اپنے بزرگوں اور اپنے سلاطین کو احترام دیتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں: نہیں' ایسا نہ کرو' یہ عمل تمہیں پست اور ذلیل کرتا ہے۔ کیوں تم اپنے آپ کو میرے سامنے' میں جو تمہارا خلیفہ ہوں' ذلیل و حقیر بنا کر پیش کرتے ہو؟ میں بھی تم ہی میں سے ایک ہوں' تم نے یہ عمل انجام دے کر میرے حق میں کوئی اچھائی نہیں کی ہے بلکہ برائی کے مرتکب ہوئے ہو۔ تمہارے اس عمل سے ممکن ہے (خدانخواستہ) کسی وقت میرے دل میں غرور پیدا ہو جائے اور میں حقیقت میں اپنے آپ کو تم سے برتر سمجھنے لگوں۔

اسے کہتے ہیں ایک آزاد مرد' ایسا شخص جو معنوی آزادی کا مالک ہے' ایسا شخص جس نے قرآن کی اس صدا کو قبول کیا ہے "أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ" "ہم خدا کے سوا کسی چیز کی' کسی فرد کی' کسی طاقت کی پرستش نہیں کرتے۔ نہ کسی انسان کی' نہ پتھر کی' نہ شجر کی' نہ مٹی کی' نہ آسمان کی' نہ خواہشات نفس کی' نہ غصے کی' نہ شہوت کی' نہ حرص و طمع کی' نہ جاہ طلبی کی۔ صرف خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اسی صورت میں وہ معاشرے کو آزادی فراہم کر سکتا ہے۔

مولا علی علیہ السلام کا ایک خطبہ ہے۔ میں اس کا ایک [illegible] آپ کی [illegible] پیش کر دوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

گا۔ دیکھئے گا کہ ایسا شخص جو حقیقت میں معنوی آزادی کا حامل ہو وہ کیسی روح کا مالک ہوتا ہے؟ کیا آپ دنیا میں ایسی ایک بھی روح ڈھونڈ سکتے ہیں؟ اگر ڈھونڈ لیں تو مجھے بتایئے گا۔

یہ انتہائی مفصل خطبہ ہے' یہ حکمراں کے رعایہ پر حقوق اور رعایہ کے حکمراں پر حقوق کے بارے میں ہے' اس میں بعض مسائل ہیں جن پر حضرت نے گفتگو فرمائی ہے' اس کے بعد اسکے ذیل میں چند جملے ہیں (دیکھئے' یہ جملے کون کہہ رہا ہے؟ خود والی اور حاکم ہے جو اپنی زبان سے لوگوں سے کہہ رہا ہے۔ ہماری دنیا میں تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے افراد لوگوں سے کہتے ہیں کہ اپنے حکمرانوں کے ساتھ ایسے بن کر نہ رہو' آزاد مرد بنو' جبکہ وہاں خود علی کہتے ہیں کہ میں جو تمہارا حاکم ہوں' میرے سامنے ایسے نہ ہو جاؤ' آزاد مرد بنو): لَا تُكَلِّمُونِي بِمَا تُكَلَّمُ بِهِ الْجَبَابِرَةُ. مباداایسے الفاظ میرے لئے بھی استعمال کرنے لگو جو تم جباروں کے سامنے استعمال کرتے ہو' جن کے ذریعے اپنے آپ کو پست ظاہر کرتے ہو' ذلیل بتاتے ہو' ان کے قدموں کی خاک قرار دیتے ہو' اور انہیں بلند مقام بتاتے ہو' عرش پر پہنچاتے ہو۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پای تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان زند

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میرے ساتھ اس انداز میں گفتگو کرنے لگو' ہرگز نہیں' مجھ سے ایسے ہی بات کرو جیسے دوسروں سے بات چیت کرتے ہو' وَلَا تَتَحَفَّظُوا مِنِّي بِمَا يُتَحَفَّظُ بِهِ عِنْدَ أَهْلِ الْبَادِرَةِ " اور اگر دیکھو کہ کبھی میں غصے میں آ گیا ہوں' تندو تیز انداز میں گفتگو کر رہا ہوں' تو ہاتھ پاؤں پھلا نہ بیٹھو' مردانگی کے ساتھ اپنی تنقید جاری رکھو' مجھ سے فاصلہ نہ رکھو' وَلَا تُخَالِطُونِي بِالْمُصَانَعَةِ " مجھ سے یہ نہ کہو کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں بجا ہے' آپ کا ہر عمل درست اور قابل ستائش ہے۔ یہ خوش آمد اور چاپلوسی ہے' میرے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو۔ " وَلَا تَظُنُّوا بِي اسْتِثْقَالاً فِي حَقٍّ قِيلَ " یہ نہ سوچنا کہ تم نے اگر میرے سامنے کوئی ایسا جملہ کہا جو حق ہے' یعنی اگر میرے خلاف کوئی ایسی بات کہی جو حق ہے' تو وہ مجھے ناگوار گزرے گا۔ مجھ پر جائز تنقید کرو' ہرگز وہ میرے لئے سنگین اور ناگوار نہ ہو گی' میں انتہائی خنداں روئی کے ساتھ تمہاری بات مانوں گا" وَلَا الْتِمَاسَ إِعْظَامٍ لِنَفْسِي " اے وہ لوگو! جن کا میں خلیفہ اور وہ میری رعیت ہیں! یہ نہ سمجھنا کہ میں تم

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے یہ خواہش رکھتا ہوں کہ تم میری تمجید و تعظیم کرو' میرے ساتھ خوش آمدانہ باتیں کرو' میری ستائش کرو' ہرگز نہیں۔

اسکے بعد آپ ایک کلی قاعدہ بیان کرتے ہیں " فَإِنَّهُ مَنِ اسْتَثْقَلَ الْحَقَّ أَنْ يُقَالَ لَهُ أَوِ الْعَدْلَ أَنْ يُعْرَضَ عَلَيْهِ كَانَ الْعَمَلُ بِهِمَا أَثْقَلَ عَلَيْهِ " یعنی ایسا شخص جس کے سامنے اگر حق بات کہی جائے' تو اسکے لئے اسے سننا دشوار ہوتا ہو' اسے ناگوار گزرتا ہو کہ کیوں اسکے سامنے حق بات کہی گئی' تو ایسے شخص کے لئے حق پر عمل کرنا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

کرسٹی سن لکھتا ہے: نوشیرواں نے چند لوگوں کو مشورے کے لئے جمع کیا ہوا تھا اور ان سے ایک مسئلے پر مشاورت کر رہا تھا۔ نوشیرواں نے اپنی رائے بیان کی۔ وہاں موجود سب افراد نے کہا کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہی درست ہے۔ ایک درباری جو دھوکے میں تھا' اس نے سمجھا تھا کہ سچ مچ یہ اجلاس مشاورت کے لئے ہے اور اسے بھی اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے۔ لہٰذا اس نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنی رائے بیان کروں۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا' نوشیرواں کی رائے میں جو نقائص پائے جاتے تھے انہیں بھی بیان کیا۔ {یہ دیکھ کر} نوشیرواں نے کہا: اے بے ادب' اے گستاخ اور پھر فوراً حکم دیا کہ اسے اس گستاخی کی سزا دی جائے۔ وہاں موجود قلمدانوں سے سب کے سامنے اس قدر اس کے سر پر ضربات لگائی گئیں کہ وہ مر گیا۔

جس شخص کے لئے حق بات سننا گراں ہو۔ اگر کسی سے کہیں کہ عدالت کے مطابق سلوک کرو اور اسے یہ بات ناگوار گزرے' تو قطعی طور پر جان لیجئے کہ حق اور عدالت پر عمل اسکے لئے اس سے کہیں زیادہ سنگین اور ناگوار ہو گا۔

آخر میں خواہش فرماتے ہیں کہ: فَلَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ أَوْ مَشُورَةٍ بِعَدْلٍ. (۱)

۱۔ مجھ سے ویسی باتیں نہ کیا کرو جیسی جابر اور سرکش حکمرانوں سے کی جاتی ہیں اور نہ مجھ سے اس طرح بچا کرو جس طرح غصیلے حکمراں سے بچ بچاؤ کیا جاتا ہے' اور مجھ سے ایسا میل جول نہ رکھو جس سے چاپلوسی اور خوش آمد کا پہلو نکلتا ہو۔ میرے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ اگر میرے سامنے کوئی حق بات کی گئی تو وہ مجھے گراں گزرے گی' اور نہ یہ خیال کرنا کہ میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے (بقیہ اگلے صفحے پر)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

اے میرے اصحاب! میرے دوستو! اے لوگو! تم سے میری یہ خواہش ہے کہ ہرگز حق بات کہنے، برحق تنقید کرنے اور مجھے اپنا مشورہ دینے سے باز نہ رہنا۔

یہ ایسے مرد کا نمونہ کامل ہے جو معنوی لحاظ سے آزاد ہے اور حکومت پر ہوتے ہوئے اس طرح دوسروں کو سماجی آزادی دیتا ہے۔

بارالہا! تجھے علی ابن ابی طالب کے حق کی قسم دیتے ہیں کہ ہمیں علی کے حقیقی پیروکاروں میں سے قرار دے۔

☆......☆......☆

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) سامنے حق کہا جانا اور عدل پیش کیا جانا بھی گراں گزرے اس کے لئے حق و انصاف پر عمل کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوگا۔ تم حق بات کہنے اور عدل کا مشورہ دینے سے باز نہ رہو۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۱۴)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

معنوی آزادی☆

(۲)

"وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَ الْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ." (۱)

گزشتہ ہفتے ہم نے عرض کیا تھا کہ معنوی آزادی کے بارے میں ہماری پوری گفتگو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ: آزادی کے معنی کیا ہیں؟ دوسرے یہ کہ: آزادی کی دو قسمیں ہیں، معنوی آزادی اور سماجی آزادی۔ تیسرا مرحلہ ان دو قسم کی آزادیوں کی ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی بالخصوص سماجی آزادی کی معنوی آزادی کے ساتھ وابستگی۔

آج کی شب ہم اپنی گزارشات کو خود معنوی آزادی کے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اس بات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ معنوی آزادی دراصل ہے کیا چیز اور انسان کے لئے معنوی آزادی کا حامل ہونا ضروری ہے بھی یا نہیں؟

ہم اس مسئلے پر خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے بھی توجہ دینا چاہتے ہیں کہ دور حاضر میں معنوی آزادی پر توجہ بہت کم ہو گئی ہے۔ اور یہ چیز بھی عصر حاضر کی مشکلات اور پریشانیوں کا ایک

☆۔ یہ تقریر گزشتہ تقریر کے ایک ہفتے بعد اسی مقام پر کی گئی۔

۱۔ اور (وہ پیغمبر) ان پر سے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اتھا دیتا ہے [illegible]

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

سبب ہے۔ بہت سے لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ اب یہ مسائل منسوخ ہو چکے ہیں۔ جبکہ صورتحال اسکے برعکس ہے' آج کے دور میں انسان کو معنوی آزادی کی ضرورت اگر گزشتہ ادوار سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں ہے۔

معنوی آزادی کیا ہے؟

آزادی کے لئے ہمیشہ دو چیزیں ہونی چاہئیں۔ ایک چیز قید ہو اور دوسری چیز آزاد ہو۔ معنوی آزادی میں انسان کس سے آزاد ہونا چاہتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ معنوی آزادی' سماجی آزادی کے برخلاف انسان کی خود اپنے آپ سے آزادی کا نام ہے۔ سماجی آزادی' انسان کی دوسرے افراد کی قید اور اسیری سے آزادی کا نام ہے' لیکن معنوی آزادی' آزادی کی ایک خاص قسم ہے اور دراصل انسان کی خود اپنی قید اور غلامی سے آزادی ہے۔

پھر لازماً یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا انسان خود اپنا قیدی اور اسیر ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چیز خود ہی غلام ہو اور خود ہی اپنے آپ کو غلام بنانے والی' خود ہی قیدی ہو اور خود ہی اپنے آپ کو قید کرنے والی؟!

کیا ایسا ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں' ممکن ہے۔ شاید کسی اور کے لئے ممکن نہ ہو {لیکن انسان کے لئے ممکن ہے} مثال کے طور پر ممکن ہے حیوانات میں معنوی غلامی اور اسکے بالمقابل معنوی آزادی کا کوئی مفہوم اور امکان نہ ہو' لیکن انسان میں' اس انوکھی اور عجیب مخلوق میں' یہ امکان موجود ہے کہ وہ خود اپنا غلام اور قیدی ہو یا خود اپنے آپ سے آزاد ہو۔

یہ کیسے ممکن ہے؟۔

انسان ایک مرکب موجود ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے موجودات کے درمیان انسان ایک مرکب شخصیت کا مالک ہے' یہ ایک حقیقت ہے۔ انسان کے ایک مرکب شخصیت اور موجود ہونے کی تاکید ادیان اور

http://fb.com/ranajabirabbas

فلسفیوں نے کی ہے' دانشوروں حتیٰ نفسیات دانوں نے کی ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

ہم قرآن مجید اور حدیث کے ذریعے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ نے قرآن کریم میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ انسان کی خلقت کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۱) خداوند عالم فرشتوں سے فرماتا ہے: جب اس موجود کی خلقت مکمل کرلوں اور اسمیں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں' تو تم اسکے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔ اللہ رب العزت کہتا ہے کہ یہ ایک خاکی موجود ہے' میں نے اسے خاک سے خلق کیا ہے' ایک طبیعی اور مادی موجود ہے۔ لیکن یہی آب و خاک سے خلق کیا گیا موجود' یہی موجود جو دوسرے حیوانوں کی مانند بدن اور جسم کا مالک ہے' میں اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک رہا ہوں۔

ہمارے لئے "روح خدا" کے معنی جاننا ضروری نہیں' یعنی یہ کہ نفخه الٰهى اور جس چیز کو خدا نے اپنی روح کہا ہے' وہ کیا چیز ہے' {اس سے واقفیت ہم پر لازم نہیں ہے} اجمالی طور پر ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس خاکی موجود میں' ایک غیر خاکی چیز بھی پائی جاتی ہے۔ معروف حدیث ہے' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خداوند عالم نے فرشتوں کو خلق کیا اور ان کی سرشت میں صرف عقل رکھی' حیوانات کو خلق فرمایا اور ان کی سرشت میں محض شہوت رکھی' انسان کو خلق کیا اور اسکی سرشت میں عقل بھی رکھی اور شہوت بھی۔ مولانا روم نے اسی مضمون کو کچھ اس انداز سے شعر کی صورت میں ڈھالا ہے:

گفت پیغمبر کہ خلاق مجید   خلق عالم را سہ گونہ آفرید (۲)

اسکے بعد کہتے ہیں کہ ان مخلوقات میں سے ایک گروہ فرشتوں کا ہے' ایک حیوانات کا اور ایک انسانوں کا۔

۱۔ پھر جب مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں' تو سب کے سب سجدے میں گر پڑنا۔ (سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۹)

۲۔ پیغمبر نے فرمایا ہے کہ خالق نے کائنات کی مخلوقات کو تین گروہوں میں پیدا کیا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اب معنوی آزادی کے مسئلے کو ذرا سادہ وزبان میں سمجھنا ممکن ہے۔ قطع نظر ان مفاہیم اور مسائل کے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے' حدیث میں آیا ہے' بالخصوص عرفاء نے جن کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے' علمائے نفسیات نے جن کی تائید کی ہے' ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے معنوی آزادی کے اس مسئلے کو سادہ وزبان میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم گفتگو کو ایک ایسی بات سے شروع کرتے ہیں جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ

دوسرے انسانوں کے لئے روح کی غلامی

بے شک ہمیں اپنی زندگی میں بہتر سے بہتر خوراک کی ضرورت ہوتی ہے' عالیشان سے عالیشان پوشاک کی ضرورت ہوتی ہے' رہنے کے لئے آراستہ ترین مکان کی ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح بیوی بچوں کی ضرورت ہوتی ہے' زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائشوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مال و دولت' روپے پیسے اور مادّیات کے بھی آرزومند ہوتے ہیں۔ لیکن ایک جگہ پر ایک دوراہے پر آ کھڑے ہوتے ہیں' ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر یا تو ہمیں اپنی عزت وسیادت اور آقائی کی حفاظت کرنی چاہئے البتہ فقر وافلاس قبول کر کے۔ کھانا کھائیں لیکن روکھا سوکھا' لباس پہنیں لیکن پھٹا پرانا' گھر ہو لیکن تنگ' چھوٹا' معمولی روپیہ پیسہ نہ ہو' تنگی ترشی میں بسر کریں' یا پھر اپنی عزت وآقائی اور سیادت کو نظر انداز کر دیں' ذلت قبول کر لیں' خادم بن جائیں تو تمام مادّی نعمتیں ہمارے لئے فراہم ہو جائیں گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بکثرت لوگ کسی صورت ذلت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے' خواہ اسکے عوض انہیں سونے چاندی میں تول دیا جائے' البتہ بعض لوگ ذلت کا طوق پہننے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ حضرات بھی اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں ایک خفت اور شرمساری سی محسوس کرتے ہیں۔

سعدی گلستان میں دو بھائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھائی دولتمند تھا اور دوسرا غریب۔ (بقول اُن کے) دولت مند بھائی دربار کے خادموں میں سے تھا۔ حاکم کے خدمت گزاروں میں شامل تھا جبکہ غریب بھائی مزدور تھا' سعدی کی تعبیر کے مطابق اپنے زورِ

http://fb.com/ranajabirabbas

بازو سے روٹی کماتا تھا۔ وہ کہتے ہیں: ایک روز دولتمند بھائی نے اپنے غریب بھائی سے کہا: بھائی! تم کیوں درباری ملازمت نہیں کر لیتے' تاکہ تمہیں بھی اس مشقت سے چھٹکارا ملے؟ تم بھی میری طرح دربار کے خادموں میں شامل ہو جاؤ' تاکہ اس زحمت اور مشقت طلب کام سے نجات حاصل کر سکو۔ وہ کہتے ہیں: یہ سن کر غریب اور مفلس بھائی نے جواب دیا: تم خود کیوں کوئی کام کاج نہیں کر لیتے تاکہ نوکری کی اس ذلت سے تمہاری جان چھوٹے؟ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں دربار کے خدمت گزاروں میں کیوں شامل نہیں ہو جاتا' تاکہ محنت مزدوری کی مشقت سے نجات پاؤں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کیوں محنت مزدوری نہیں کرتے' زحمت و مشقت کے متحمل نہیں ہوتے' تاکہ درباری نوکری اور ذلت سے رہائی حاصل کر سکو؟

وہ اس خدمت گزاری کو' باوجود یہ کہ اسمیں مال و دولت ہے' طاقت وقدرت ہے (لیکن کیونکہ نوکری ہے' اسمیں آزادی سلب ہوتی ہے' کیونکہ دوسرے کے سامنے جھکنا پڑتا ہے) لہٰذا اسے ذلت قرار دیتا ہے۔ اسکے بعد سعدی کہتے ہیں کہ: داناؤں کا کہنا ہے کہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھانا' زریں کمربند باندھ کر دوسروں کی خدمت گزاری سے بہتر ہے۔

بدست آھن تفتہ کردن خمیر   بہ از دست بر سینہ پیش امیر

ممکن ہے اس بارے میں بہت سی باتوں سے آپ خود بھی واقف ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بارے میں نفسیات کے پہلو سے تجزیہ و تحلیل کیجئے کہ یہ کونسی حس ہے جس کے تحت انسان زحمت و مشقت' محنت و مزدوری' فقر و مسکنت جیسی چیزوں کو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی جی حضوری پر ترجیح دیتا ہے؟ اسے قید و اسیری کا نام دیتا ہے' کہتا ہے کہ میں کسی غیر کا غلام بننے پر تیار نہیں۔ جبکہ یہ غلامی مادّی نہیں' یعنی درحقیقت وہ اپنی قوت و طاقت سے خدمت نہیں کرتا' بلکہ فقط اسکی روح خدمت کرتی ہے' اسکا بدن خدمت نہیں کرتا۔ یہ غلامی اور بندگی کی ایک قسم ہے' درست بھی ہے کہ یہ غلامی ہے۔ لیکن ایک ایسی غلامی ہے جس میں انسان کا تن بدن غلام نہیں ہوتا بلکہ اسکی روح غلام ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ایک رباعی [illegible] اس

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

معروف دیوان میں ہے۔ فرماتے ہیں

تَحْدُ کَدُ الْعَبْدِ اِنْ اَحْبَبْتَ اَنْ تُصْبِحَ حُرّاً
وَاقْطَعِ الْآمَالَ مِنْ مَالِ بَنِی آدَمَ طُرّاً
لَا تَقُلْ ذَا مَکْسَبٌ یُزْرِی فَقَصْدُ النَّاسِ اَزْرَی
اَنْتَ مَا اسْتَغْنَیْتَ عَنْ غَیْرِکَ اَعْلَی النَّاسِ قَدْراً

فرماتے ہیں: اگر تمہارا دل آزاد زندگی بسر کرنے کو چاہتا ہے تو غلاموں کی مانند زحمت اٹھاؤ' کام کرو' مشقت برداشت کرو اور فرزند آدم (خواہ وہ کوئی بھی ہو چاہے حاتم طائی ہی کیوں نہ ہو) کے مال و دولت پر نظر نہ رکھو۔ یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ صرف پست اور دنی الطبع افراد کے مال و دولت کو لالچ کی نظر سے نہ دیکھو بلکہ ایسے لوگ جو جود و کرم میں حاتم طائی کی مثل ہوں ان کے مال کی طرف سے بھی چشم طمع بند رکھو۔ اسکے بعد فرماتے ہیں: بعض افراد کے سامنے جب مختلف پیشے رکھے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی پیشہ اختیار کر لیں' تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ یہ پیشہ میری شان کے خلاف ہے' پست ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ مزدوری کر لو' کدال چلا لو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گھٹیا اور نچلے درجے کا کام ہے۔ کہا جاتا ہے حمالی (بوجھ اٹھانے) کا کام کر لو تو کہتے ہیں کہ یہ پست کام ہے۔ فرماتے ہیں' جس کام کو بھی تم پست اور گھٹیا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے سامنے دست طمع دراز کرنے سے زیادہ گھٹیا نہیں ہوتا۔

"لَا تَقُلْ ذَا مَکْسَبٌ یُزْرِی فَقَصْدُ النَّاسِ اَزْرَی"

"کوئی چیز اس سے بڑھ کر پست نہیں کہ تم لوگوں کے پاس ان سے کچھ لینے کی غرض سے جاؤ۔"

"اَنْتَ مَا اسْتَغْنَیْتَ عَنْ غَیْرِکَ اَعْلَی النَّاسِ قَدْراً"

"تم جتنا دوسروں سے بے نیاز ہو گے اتنا ہی لوگوں سے برتر ہو گے۔"

میرے خیال میں میں نے جاحظ کے کلام میں دیکھا ہے' یا اہل سنت کے ایک اور عالم کے کلام میں جاحظ ... (خود جاحظ بھی غیر معمولی طور پر بلیغ شخص تھے) انصاف کی بات

http://fb.com/ranajabirabbas

ہے کہ مرد سخن تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے کلام کو غیر معمولی احترام دیتے تھے اور اس بارے میں عجیب باتیں فرماتے تھے) کہتے تھے حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں نو کلمات ایسے ہیں جن کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں۔ ان نو کلمات میں سے تین ہمارے زیر بحث موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

"اِحْتَجْ اِلَی مَنْ شِئْتَ تَکُنْ اَسِیرَهُ. اِسْتَغْنِ عَمَّنْ شِئْتَ تَکُنْ نَظِیرَهُ
اَحْسِنْ اِلَی مَنْ شِئْتَ تَکُنْ اَمِیرَهُ." (۱)

یعنی جس کسی کے محتاج ہونا چاہتے ہو ہو جاؤ۔ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ جس کے محتاج ہو گے اسکے غلام ہو جاؤ گے۔ جس کسی کی مانند بننا چاہتے ہو اس سے بے نیاز ہو جاؤ' جس کے امیر و آقا بننا چاہتے ہو اس سے نیکی کرو۔

پس دوسروں کی محتاجی ایک طرح کی غلامی اور بندگی ہے۔ لیکن یہ کس طرح کی غلامی ہے؟ جسمانی غلامی ہے؟ نہیں' بلکہ روح کی غلامی ہے' معنوی غلامی ہے۔

اس بارے میں کس قدر خوبصورت باتیں کی گئی ہیں' بصد افسوس آج ان موضوعات پر بہت کم گفتگو کی جاتی ہے۔ البتہ ایک اعتبار سے کیونکہ دوسرے مسائل درپیش ہیں اور انسان چاہتا ہے کہ ان کے بارے میں گفتگو کرے۔ لہٰذا اخلاقی مباحث کم کم ہی زیر بحث آتے ہیں۔ حالانکہ ان پر بھی کثرت سے گفتگو ہونی چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلطَّمَعُ رِقٌّ مُؤَبَّدٌ (۲) یعنی لالچی ہونا غلامی سے بدتر ہے۔ اس بارے میں بھی بکثرت باتیں اور قابل بحث مسائل ہیں۔

اس بنیاد پر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جسم کی غلامی کے علاوہ ایک دوسری قسم کی غلامی بھی ہے۔ ایسی غلامی جس میں انسان کا جسم آزاد ہوتا ہے۔ اُس داستان میں جو سعدی نے امیر اور غریب

۱۔ غرر الحکم طبع تہران یونیورسٹی۔ ج ۲۔ ص ۵۸۳۔
۲۔ لالچ ہمیشہ ہمیش کی غلامی ہے۔ (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۸۰)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

بھائیوں کے بارے میں بیان کی ہے' امیر بھائی کے پاس فقیر بھائی سے کہیں زیادہ اور غیر معمولی مادی وسائل موجود تھے' اسکا جسم' اسکے جسم سے بہت زیادہ آزاد تھا۔ اس کا جسم تو بیچارہ ہمیشہ محنت مشقت کی چکی میں پستا رہتا تھا لیکن اس (غریب بھائی) کی روح اس مالدار بھائی سے زیادہ آزاد تھی۔ پس یہاں آپ اجمالاً سمجھ سکتے ہیں کہ ایک اور قسم کی غلامی بھی ہوتی ہے' جو جسم کی غلامی نہیں ہے' ایک اور قسم کی آزادی بھی ہے جو جسم اور تن کی آزادی نہیں ہے۔

مال و دولت کی غلامی

یہاں سے ایک درجہ بلندی پر آیئے۔ آزادی اور غلامی کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ تمام علمائے اخلاق نے انسان کو مال و دولت کی غلامی سے خبردار کیا ہے۔ اسی عنوان کے تحت کہ اے انسان! دنیا کے مال و دولت کا بندہ اور غلام نہ بن' حضرت علی علیہ السلام کا ایک جملہ ہے' فرماتے ہیں: اَلدُّنْیَا دَارُ مَمَرٍّ لَا دَارُ مَقَرٍّ. دنیا انسان کے لئے گزرگاہ ہے' قرار گاہ نہیں۔ اسکے بعد فرماتے ہیں: وَالنَّاسُ فِیْهَا رَجُلَانِ. دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں رَجُلٌ بَاعَ نَفْسَهٗ فِیْهَا فَاَوْبَقَهَا وَ رَجُلٌ ابْتَاعَ نَفْسَهٗ فَاَعْتَقَهَا. (۱) دنیا کے اس بازار میں آنے والے' دنیا کی اس گزرگاہ میں آنے والے انسان دو طرح کے ہیں' بعض آتے ہیں اور اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں' غلام بنا ڈالتے ہیں اور کوچ کر جاتے ہیں' بعض دوسرے آتے ہیں' اپنے آپ کو خریدتے ہیں' آزاد کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

انسان اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ دنیا کے مال و دولت کے حوالے سے وہ دو حالتیں اپنا سکتا ہے۔ چاہے تو دنیا کی دولت کا غلام اور اسکا قیدی بن کے رہ جائے اور چاہے تو اسکی قید و بند سے آزاد زندگی بسر کرے۔ کہتے ہیں:

بند بگسل' باش آزاد ای پسر   چند باشی بند سیم و بند زر

۱۔ اس (دنیا) میں دو طرح کے لوگ ہیں: ایک وہ جنہوں نے اس میں اپنے آپ کو بیچ کر ہلاک کر لیا اور ایک وہ جنہوں نے [illegible] (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۳۳)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسان کہتا ہے کہ جس طرح مجھے اپنے جیسے انسانوں کا غلام نہیں بن جانا چاہئے (نہ میرا جسم اپنے جیسے لوگوں کا غلام بنے اور نہ میری روح) اسی طرح میری روح کو بھی مال دنیا کا غلام اور اس کا اسیر نہیں بننا چاہئے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان ایک بلند مفہوم کا سامنا کرتا ہے' وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ کیا مال دنیا کی بندگی بھی کوئی چیز ہے؟

کیا دنیا کے مال و دولت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کو اپنا غلام بنا لے؟ مال دنیا سے مراد دولت و ثروت' یعنی سونا' چاندی' گھر' زمین اور جائیداد وغیرہ جیسی چیزیں ہیں۔

کیا ان چیزوں میں انسانوں کو غلام بنا لینے کی قدرت پائی جاتی ہے؟! میں انسان ہوں' زندہ ہوں' جبکہ وہ چیزیں جماد ہیں' مردہ ہیں۔ کیا جماد اور مردہ چیزوں میں اتنی قدرت ہے کہ وہ کسی زندہ ہستی کو اپنا غلام بنا لیں؟! نہیں۔

پس تو پھر مسئلے کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ اس مقام پر بھی جہاں انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ دنیا کا بندہ اور غلام ہے' مال و دولت کا قیدی ہے' وہاں بھی وہ درحقیقت مال و دولت کا غلام نہیں ہوتا' بلکہ اپنی باطنی خصائص کا غلام ہوتا ہے' اپنی حیوانیت کا بندہ ہوتا ہے' حرص کا غلام ہوتا ہے۔ یعنی اس نے خود اپنے آپ کو غلام بنایا ہوتا ہے' ورنہ روپے پیسے میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ انسان کو اپنا غلام بنا لے' زمین میں اتنی سکت نہیں کہ وہ انسان کو اپنا بندہ بنا لے' مال مویشی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ انسان کو اپنی بندگی میں لے لے' گاڑی میں اتنی طاقت نہیں' وہ تو جماد ہے اور جماد سرے سے انسان پر تصرف کر ہی نہیں سکتا۔

جب انسان اس مسئلے کا اچھی طرح تجزیہ و تحلیل کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ وہ خود ہی ہے جس نے اپنے آپ کو غلام بنایا ہوا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ خود اسکے اندر حرص نام کی ایک طاقت ہے' طمع و لالچ نام کی ایک قوت ہے' غصہ نام کی ایک طاقت ہے' خواہش نفس نامی ایک قدرت ہے جس نے اسے غلام بنایا ہوا ہے۔ یہ غصہ ہے جس نے اسے اپنا بندہ بنا لیا ہے' یہ حرص ہے جس نے اسے اپنی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

بندگی میں لے لیا ہے' یہ طمع ہے جس نے اسے اپنا غلام بنالیا ہے' یہ نفسانی خواہش ہے جس نے اسے اپنی خدمت پر مامور کرلیا ہے۔ افرء یت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ (۱) قرآن کریم کہتا ہے کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش ہی کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے' اپنی نفسانی خواہش کا بندہ بن گیا ہے؟

یہاں انسان پر حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ دنیا کا مال و دولت بذاتہ مذموم نہیں ہے۔ اگر یہ کہا گیا ہے کہ دنیا کے مال و دولت سے بچ کر رہو' کہیں یہ تمہیں اپنا غلام نہ بنا لے تو مال و دولت میں تو اتنی طاقت نہیں ہے کہ مجھے اپنا غلام بنا لے' دراصل یہ میں خود ہوں جو خود اپنے آپ کو بندہ و غلام بناتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: پس میں اپنے آپ کو غلیظ نفسانی خواہشات کی قید سے آزاد کروں گا۔ اس موقع پر مجھے پتا چلے گا کہ دنیا کے مال و دولت میرے خدمت گزار ہیں' میں اُن کا خادم نہیں۔

یہاں پہنچ کر وہ اپنے مقام کو پہچانتا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھ لیتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے: ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا (۲) وہ خدا وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے اُس سب کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مال و دولت میرے بندے اور غلام ہیں۔ وہ میرے خادم ہیں' نہ کہ میں ان کا خدمت گزار۔ پس پھر بخل کیا چیز ہے؟ افزوں طلبی کی خاطر افزوں طلبی کیا چیز ہے؟!

ہاں دراصل انسان خود اپنا اسیر ہو جاتا ہے' خود اپنا بندہ اور غلام بن جاتا ہے۔

انسان دو مقام کا حامل ہے' اسکے دو درجے ہیں۔ ادنیٰ درجہ' حیوانی درجہ اور عالی درجہ' انسانی درجہ۔ انبیا انسان کی معنوی آزادی کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ مراد یہ ہے کہ اُن کی آمد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی شرافت' انسان کی انسانیت' انسان کی عقل اور انسان

۱۔ کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے۔ (سورۂ جاثیہ ۴۵۔ آیت ۲۳)

۲۔ وہ خدا جس نے [illegible] کو تمہارے ہی لئے خلق کیا ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۹)

http://fb.com/ranajabirabbas

کے ضمیر کو انسان کی نفسانی خواہشات کا اسیر نہ ہونے دیں' انسان کے غصے کا اسیر نہ ہونے دیں' انسان کی مفاد پرستی کا اسیر نہ ہونے دیں۔ یہ ہیں معنوی آزادی کے معنی۔

جب بھی آپ محسوس کریں کہ آپ اپنے غصے پر مسلط ہیں' آپ کا غصہ آپ پر حاوی نہیں' تو سمجھئے کہ آپ آزاد ہیں۔ جب بھی آپ محسوس کریں کہ آپ اپنی نفسانی خواہش پر غالب ہیں' آپ کی نفسانی خواہش آپ پر مسلط نہیں۔ جب بھی کوئی ناجائز آمدنی آپ کے سامنے آئے اور آپ کا نفس آپ کو اسے لینے پر شوق دلائے اور کہے کہ اسے قبول کرلو' لیکن آپ کا ایمان' ضمیر اور عقل فیصلہ دے کہ یہ ناجائز ہے' اسے ہاتھ نہ لگاؤ اور اس موقع پر آپ اپنے نفسانی میلان پر غالب آجائیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ معنوی لحاظ سے حقیقتاً ایک آزاد مرد ہیں۔

اگر آپ سر راہ ایک نامحرم عورت کو دیکھیں اور آپ کی نفسانی خواہش آپ کو اسے تاڑنے اور اسکا تعاقب کرنے پر ابھارے' لیکن آپ پر حاکم وجدان آپ کو اس عمل سے روکے اور آپ اسکے اس حکم کی تعمیل کریں تو سمجھ لیجئے کہ آپ مرد حر ہیں۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ آپ کی نگاہوں نے ایک چیز کو پسند کیا ہے اور آپ اس کے تعاقب میں چل پڑے ہیں' آپ کی سماعت کو کوئی صدا اچھی لگی ہے اور آپ نے اس کی طرف کان لگا دیے ہیں' آپ کی شہوت ایک چیز کو چاہتی ہے اور آپ اسکے پیچھے چل دیے ہیں' آپ کا شکم ایک چیز چاہتا ہے اور آپ اسکے حصول کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ (اگر ایسا ہے تو جان لیجئے کہ) آپ اسیر ہیں' بندے ہیں' غلام ہیں۔

انسانی اور حیوانی انانیت

انسان ایک مرکب موجود ہے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسان میں دراصل دو "میں" حاکم ہیں۔ ایک انسانی "میں" اور دوسری حیوانی "میں"۔ اور انسان کی حقیقی "میں" انسانی "میں" ہے۔ مولانا روم نے "مجنوں اور اونٹنی" نامی اس داستان میں کس قدر عالی انداز میں انسان کے اس اندرونی تضاد کے مسئلے کا ذکر کیا ہے' انسان واقعاً مظہر تضاد ہے' انسان کی طرح کسی اور موجود میں اس اندرونی اور داخلی تضاد کی حکمرانی نہیں [illegible] اس داستان میں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

اس طرح بیان کیا ہے کہ: مجنوں نے اونٹنی کو تیزی سے دوڑانے کے لئے اور اس مقصد کی خاطر کہ اونٹنی کا بچہ راستے میں تاخیر کا سبب نہ بنے اس بچے کو گھر میں بند کر دیا اور اونٹنی پر سوار ہو کے چل دیا۔ لیلیٰ کے خیال نے راستے میں مجنوں کو بے خود کر دیا۔ اسے لیلیٰ کے سوا کسی چیز کا خیال نہ تھا۔ جبکہ دوسری طرف اونٹنی کے بھی تمام تر حواس اپنے بچے میں مشغول تھے اور اسے اپنے بچے کے سوا کسی دوسری چیز کی خبر نہ تھی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ ایک سرے پر اونٹنی کا بچہ تھا اور دوسرے سرے پر لیلیٰ کا گھر۔ ایک آغازِ سفر کی جگہ تھی اور دوسرا اختتامِ سفر کا مقام۔ جب تک مجنوں اونٹنی کی لگام مضبوطی سے تھامے رہا، اُس وقت تک اونٹنی اس کی مرضی کے مطابق چلتی رہتی لیکن جب مجنوں کے حواس اپنے معشوق کی طرف متوجہ ہوتے تو اونٹنی کی مہار اسکے ہاتھ سے چھوٹ جاتی۔ اونٹنی جب یہ دیکھتی کہ اسکی لگام چھوٹ چکی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف پلٹنے لگتی۔ مجنوں کو ہوش آتا تو وہ دیکھتا کہ وہ دوبارہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اونٹنی کو واپس پلٹاتا اور ایک مرتبہ پھر اپنے سفر کا آغاز کرتا۔ کچھ دیر چلتا، یہاں تک کہ ایک بار پھر اپنے حواس سے بیگانہ ہو جاتا۔ اونٹنی جب یہ دیکھتی تو پھر پلٹ جاتی۔ الغرض یہ عمل کئی مرتبہ دھرایا گیا۔

ہمچو مجنون در تنازع با شتر	گہ شتر چہ بید و گہ مجنون حر
میل مجنون پس سوی لیلی روان	میل ناقہ از پی طفلش دوان

یہاں تک کہ بقول مولانا روم مجنوں اپنے آپ کو زمین پر گرا لیتا ہے اور کہتا ہے:

گفت ای ناقہ چو ہر دو عاشقیم	ما دو ضد بس ہمرہ نالایقیم

پھر اپنے آپ کو پیٹتے ہوئے کہتا ہے:

جان گشادہ سوی بالا بالہا	تن زدہ اندر زمین چنگالہا

انسان میں دو رجحان پائے جاتے ہیں۔ ایک انسان کی روح کا رجحان اور دوسرا انسان کے جسم کا رجحان۔

میل جان اندر ترقی و شرف	میل تن در کسب اسباب و علف

اگر آپ اپنی روح کو آزاد کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ ممکن نہیں کہ آپ شکم پرست ہوں زن

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پرست ہوں اور آپ کی روح آزاد ہو، روپے پیسے کے شیدائی ہوں اور آپ کی روح آزاد ہو۔ درحقیقت آپ شہوت پرست نہیں ہو سکتے، غصہ پرست نہیں ہو سکتے۔ پس اگر آپ واقعی آزاد ہونا چاہتے ہیں تو اپنی روح کو آزاد کیجئے۔

اس موضوع پر ہمارے پاس کیسے نادر و نایاب کلمات ہیں۔ میں نے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ میں ایک حدیث دیکھی ہے۔ ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب صفہ(۱) کے پاس تشریف لائے۔ ان میں سے ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے نفس میں یہ حالت محسوس کرتا ہوں کہ میری نظر میں دنیا ومافیہا یکسر بے قیمت ہو چکے ہیں، اس وقت میری نگاہ میں سونا اور پتھر ایک ہی جیسے ہیں۔ یعنی ان میں سے کوئی بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ یہ نہیں کہتے کہ میں سونے اور پتھر سے ایک ہی طرح مستفید ہوتا ہوں، نہیں بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جتنی طاقت پتھر میں مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہے اتنی ہی سونے میں مجھے اپنی طرف جذب کرنے کی طاقت ہے۔ رسول کریم نے اپنے اس صحابی کی طرف دیکھا اور فرمایا: اذاً انت حرٌ۔ ہاں اب میں کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک آزاد مرد ہو۔ پس واقعاً خود معنوی آزادی ایک حقیقت ہے۔

خود اپنے بارے میں انسان کا فیصلہ

اب اس بارے میں ایک اور طرح کے دلائل پیش کریں گے۔ اس بارے میں وجدانی

۱۔ اصحاب صفہ مدینہ کے باہر سے تعلق رکھنے والے آنحضرت کے غریب اصحاب کا ایک گروہ تھا۔ یہ لوگ مہاجر تھے مال و دولت سے تہی دست تھے، ان کا گھر بار، بیوی بچے نہ تھے۔ ابتدا میں رسول کریم نے ان کے لئے مسجد نبوی کے اندر ایک جگہ مقرر کر دی تھی۔ لیکن بعد میں خداوند عالم کا فرمان نازل ہوا کہ مسجد سونے کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا آنحضرت نے مسجد کے پہلو میں ایک چبوترے کو ان کے لئے مقرر کر دیا۔ وہ لوگ جو مدینہ طیبہ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں جانتے ہیں کہ اب بھی حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کے گھر کے شمال میں یہ چبوترا موجود ہے۔ یہی اصحاب صفہ کے رہنے کی جگہ تھی۔ اصحاب صفہ میں بہت سے [illegible] لوگ شامل تھے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

داخل کا ذکر کریں گے کہ واقعاً انسان کی شخصیت ایک مرکب شخصیت ہے اور واقعاً انسان معنوی لحاظ سے آزاد بھی ہو سکتا ہے اور غلام بھی۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے انسان کو اس قدرت و صلاحیت سے نوازا ہے کہ وہ خود اپنا قاضی ہو سکتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں ہمیشہ مدعی اور مدعا علیہ کے سوا ایک تیسرا شخص قاضی ہوتا ہے۔ ایک شخص مدعی ہوتا ہے اور ایک مدعا علیہ' دونوں اشخاص ایک تیسرے شخص قاضی کے پاس جاتے ہیں اور قاضی کا کام ان دونوں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ہاں' ایک فرد مدعی ہوتا ہے ایک دوسرا فرد مدعا علیہ اور قاضی ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا فرد۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ انسان کس طرح خود اپنا مدعی ہو سکتا ہے اور پھر خود ہی اپنا مدعا علیہ ہو اور پھر خود ہی اپنا قاضی۔ یعنی خود ہی اپنے بارے میں فیصلہ صادر کرے؟

انصاف کے کیا معنی ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا با انصاف آدمی ہے۔ اسکے کیا معنی ہیں؟

درحقیقت با انصاف آدمی وہ ہے جو اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے مسائل میں غیر جانبدارانہ فیصلہ کر سکے اور اگر کبھی خود قصوروار ہو تو ایسے موقع پر خود اپنے خلاف فیصلہ صادر کر سکے۔

یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟

یہ انسان کی شخصیت کے مرکب ہوئے بنا ممکن ہی نہیں۔ دنیا میں کتنے ہی انصاف پر مبنی ایسے فیصلوں سے آپ واقف ہیں جن میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک فرد اپنے بارے میں انصاف کرتا ہے' دوسرے کو خود پر ترجیح دیتا ہے' اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ مخالف فریق حق پر ہے' فضیلت اس کے ساتھ ہے۔

مرحوم سید حسین کوہ کمری' بزرگ اکابر علما اور اپنے زمانے کے مراجع تقلید میں سے ایک تھے۔ آذربائیجانی بھی تھے۔ آپ مرحوم آیت اللہ حجت کوہ کمری کے چچا تھے (جن کا تعلق ہمارے دور سے رہا' ہمارے استاد تھے اور ہم نے ان کی خدمت میں درس پڑھا ہے) آپ بھی ایک

بزرگ ہستی تھے۔ ان عظیم ہستی کی زندگی کا ایک انوکھا واقعہ نقل کیا جاتا ہے' اور وہ یہ ہے کہ صاحب جواہر اور ان کے بعد کے زمانے میں نجف اشرف میں آپ کا حلقہ درس تھا۔ صاحب جواہر (شیخ انصاری اعلی اللہ مقامہ) کو اس زمانے میں ابھی تک کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی' خصوصاً اس بنا پر بھی کہ آپ نجف میں زیادہ مقیم نہ رہے تھے' بہت کم عرصہ نجف میں رہے تھے' بعد میں آپ ایران کے شہروں کی سیاحت کے لئے تشریف لائے' ان معنوں میں کہ گھوم پھر کر ان شہروں کو دیکھیں' ان شہروں میں جہاں کہیں بھی کوئی ممتاز عالم ملتا آپ وہاں کچھ عرصے کے لئے ٹھہر جاتے اور اس عالم سے کسب فیض کرتے۔ ایک عرصے آپ مشہد میں رہے' کچھ عرصے اصفہان میں اور خاصے عرصے تک کاشان میں' جہاں مرحوم نراقی ہوا کرتے تھے۔ کاشان میں آپ تین برس تک مقیم رہے۔ جب آپ واپس لوٹے تو حقیقتاً ایک بزرگ ہستی بن چکے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مرحوم شیخ انصاری کوتاہ جسامت کے مالک تھے' ان کی آنکھیں بھی کچھ خراب تھیں (خوزستان کے بہت سے لوگوں کی طرح ککرے (trachoma) تھا کیونکہ آپ کا تعلق خوزستان سے تھا) اسی طرح آپ انتہائی زاہد منش مرد تھے اور سادہ اور بوسیدہ کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔ ایک پرانا اور ایک خاص طرح کا عمامہ۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی دو تین سے زیادہ نہ تھی' ایک مسجد میں پڑھایا کرتے تھے۔ اتفاق سے مرحوم آقا سید حسین بھی اسی مسجد میں تدریس کیا کرتے تھے۔ البتہ ان کے درس اس طرح ہوتے تھے کہ پہلے شیخ انصاری آتے' درس دیتے' جب ان کا درس ختم ہو جاتا تو آقا سید حسین آتے اور اپنا درس شروع کرتے۔ ایک روز مرحوم آقا سید حسین مسجد میں داخل ہوئے' آپ کسی سے ملاقات کر کے واپس پلٹے تھے' آپ نے دیکھا کہ اب اتنا وقت نہیں رہا کہ گھر جا کر واپس آ سکیں' ابھی درس میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کہنے لگے سوچا چلو مسجد چلتے ہیں اور درس کا وقت ہونے اور شاگردوں کی آمد تک وہیں بیٹھتے ہیں۔ آپ مسجد تشریف لائے' دیکھا کہ ایک معمولی شکل و صورت' وضع قطع کا حامل شخص بیٹھا دو تین افراد کو درس دے رہا ہے' آپ بھی وہیں ایک طرف بیٹھ گئے' البتہ درس کی آواز آپ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی' آپ نے ان کی باتیں سنیں' دیکھا کہ بہت [illegible]

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

استفادہ شروع کر دیا۔

اب دیکھئے کہ آقا سید حسین ایک متبحر، معروف اور مرجعیت کے قریب عالم اور وہ ایک اجنبی شخص کہ جس سے آپ آج تک یکسر واقف ہی نہ تھے۔ اگلے دن کہنے لگے کہ آج ذرا کچھ جلدی چلتا ہوں دیکھتا ہوں آج کا درس کیسا ہوتا ہے، کیا اسی طرح ہوتا ہے؟

اگلے روز عمداً ایک گھنٹہ پہلے گئے۔ اسی طرح ایک طرف بیٹھ گئے، درس سنا، دیکھا وہی فیصلہ رہا جو کل تھا، حقیقتاً یہ ایک فاضل ملا آدمی ہے اور خود مجھ سے بھی فاضل تر ہے۔ کہنے لگے مزید ایک روز آزماتا ہوں، ایک دن اور یہی عمل دھرایا، اُن کے لئے سو فیصد ثابت ہو گیا کہ یہ غیر معروف اور اجنبی شخص خود ان سے زیادہ عالم فاضل ہے اور خود وہ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد آپ جا کر اپنی جگہ بیٹھ گئے، جب آپ کے شاگرد آ چکے (ابھی شیخ کا درس ختم نہیں ہوا تھا) تو آپ نے فرمایا: طالب علمو! میں آج تم سے ایک نئی بات کہنے والا ہوں۔ وہ شیخ جو تمہیں اس کونے میں بیٹھا نظر آ رہا ہے، وہ مجھ سے کہیں زیادہ عالم فاضل ہے، میں نے اسے آزمایا ہے، خود میں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے، اگر حق بات سننا چاہتے ہو تو مجھے اور تمہیں سب کو ایک ساتھ اسکے درس میں چلنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے تمام شاگرد بھی اپنے استاد کی پیروی میں اٹھے اور چل دیئے۔

انسان میں یہ کیسا انصاف ہے؟

یہ تو سو فیصد اپنے مفادات کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا ہے۔

اس وقت سے آقا سید حسین، شیخ انصاری کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ یعنی اس طرح انہوں نے مرجعیت اپنی ذات سے لے کر عملاً دوسرے کو تفویض کر دی (آپ جانتے ہیں اگر انسان دنیاوی اعتبار سے حساب لگائے تو مرجعیت کتنا بڑا مقام ہے) کیا اس شخص کو احساس نہ تھا کہ آقائی کیا چیز ہوتی ہے؟ مدرس ہونا کیا منزلت رکھتا ہے؟ احترام کیا چیز ہے؟ حتماً وہ بھی ہماری مانند عزت و احترام سے پیش آنے پر خوش ہوتے ہوں گے انہیں بھی ہماری طرح سیادت و آقائی پسند ہو گی وہ بھی [illegible] ریاست سے طمانیت کا احساس کرتے ہوں گے ایسا نہ ہو گا

کہ انہیں اچھا نہ لگتا ہو گا۔ لیکن وہ ایک بلند و بالا آزاد روح کے مالک انسان تھے اور اپنے اور اس شخص کے درمیان قضاوت کر سکتے تھے اور اپنے خلاف فیصلہ صادر کر سکتے تھے۔

یہ ہیں اس بات کے معنی کہ انسان ایک مرکب شخصیت کا مالک ہے۔

ضمیر کی ملامت

انسان گناہ کا مرتکب ہونے کے بعد خود کو ملامت کرتا ہے۔ ضمیر کی یہ ملامت کیا چیز ہے؟ ضمیر کی یہ خلش جس کے متعلق سب ہی نے سن رکھا ہے، کیا چیز ہے؟

استعماری ممالک کچھ انسانوں کی تربیت اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کا ضمیر مردہ ہو جائے۔ اس کے باوجود وہ ضمیر جس کے متعلق ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ مر چکا ہے، اس میں ایک چھوٹا سا چراغ روشن اور زندہ ہوتا ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے والے ہوا باز کی تربیت ایسے ہی کسی جرم کے لئے کی گئی تھی۔ لیکن جب وہ وہاں گیا اور بم گرانے کے بعد اس نے آگ میں گھرے شہر پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ بے گناہ لوگ، بوڑھے، بچے اور وہ لوگ جن کا میدان جنگ سے یکسر کوئی تعلق نہ تھا آگ میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، تو اسی لمحے اسکی حالت غیر ہو گئی۔ امریکہ واپسی پر اسکا استقبال کیا گیا، اسکی عزت افزائی کی گئی (لیکن یہ سب چیزیں) اسکے ضمیر کو عذاب میں مبتلا ہونے سے نہ روک سکیں۔ ضمیر کے بوجھ نے رفتہ رفتہ اس شخص کو دیوانہ کر دیا اور بالآخر اسے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔

قرآن بھی کہتا ہے کہ: وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۱) خدا نے انسان کے اندر نفس لوامہ رکھا ہے، جس کی بدولت انسان خود اپنا واعظ اور ناصح ہو جاتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: مَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ وَاعِظاً مِنْ نَفْسِهِ لَمْ يَنْفَعْهُ مَوْعِظَةُ غَيْرِهِ۔ یعنی ایسا شخص جس کے اپنے نفس کے اندر خدا نے واعظ و ناصح نہ رکھا ہو، دوسروں کا وعظ و نصیحت اسکے لئے بے

۱۔ اور برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم۔ (سورہ قیامت ۷۵۔ آیت ۲)

jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اثر ہوتا ہے۔

اس کا کیا مطلب ہے؟

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا خیال ہے کہ دوسروں کا وعظ و نصیحت آپ کے لئے مفید ہوگا تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ پہلے آپ کو خود اپنے اندر ایک واعظ پیدا کرنا چاہئے۔ اپنے ضمیر کو زندہ کیجئے' پھر دوسروں کے وعظ و نصیحت سے بھی استفادہ کیجئے۔

انسان خود اپنے آپ کو وعظ کرتا ہے' خود اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے' خود اپنے خلاف حکم صادر کرتا اور فیصلہ دیتا ہے' انسان خود اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ ہمارے اخلاقی اور مسلمہ دینی احکامات میں سے ایک حکم محاسبۂ نفس ہے۔ کہا گیا ہے کہ خود اپنا محاسبہ کرو۔ حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا (بدقسمتی سے یہ باتیں فراموش کردی گئی ہیں) خود اپنا حساب لیجئے اور انسان خود اپنا حساب لے سکتا ہے' اور اسے اپنا حساب لینا چاہئے' وَزِنُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُوْزَنُوْا (۱) خود اپنے آپ کو تو لئے' اپنا وزن کیجئے' قبل اس کے کہ آپ کا اور آپ کے اعمال کا قیامت کے دن وزن کیا جائے' انہیں اس روز تولا جائے۔

انسان خود اپنا وزن کرتا ہے' خود کو تولتا ہے' خود اپنا محاسبہ کرتا ہے' خود اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ یہ تمام باتیں اس چیز کی دلیل ہیں کہ انسان ایک مرکب شخصیت کا مالک ہے۔ اس مرکب شخصیت کا ایک حصہ عالی اور بلند ہے' جو اس کا انسانی پہلو ہے اور ایک حصہ دانی ہے' جو اس کا حیوانی پہلو ہے۔ معنوی آزادی یعنی انسان کا عالی اور انسانی پہلو اسکے حیوانی اور شہوانی پہلو سے آزاد ہو۔

انسان کا خود اپنے آپ کو سزا دینا

ہم نے کہا تھا کہ انسان خود اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کا ایک بیان میرے ذہن میں آیا ہے۔ ایک شخص حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ استغفار کرتا ہے' توبہ کرتا ہے۔ یعنی استغفار کا صیغہ اپنی زبان پر جاری کرتا ہے۔ وہ بھی ہم میں سے بہت

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱ ص ۳۸۰۔ حدیث ۹۔

http://fb.com/ranajabirabbas

سے لوگوں کی طرح یہی سمجھتا تھا کہ بس اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ کہنے سے توبہ ہو جاتی ہے۔ امیر المومنین نے جلال سے بھرے لہجے میں اس سے فرمایا: ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ اَتَدْرِیْ مَا الْاِسْتِغْفَارُ ؟ اَلْاِسْتِغْفَارُ دَرَجَةُ الْعِلِّیِّیْنَ. (۱) یعنی خدا تجھے موت دے' تیری ماں تیرے غم میں بیٹھے! تجھے استغفار کے معنی پتا بھی ہیں جو تو کہہ رہا ہے کہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ ؟ کیا تجھے استغفار کی حقیقت کا علم ہے؟ استغفار بلند مرتبہ لوگوں کا درجہ ہے۔ دراصل توبہ خود اپنے آپ کی مذمت کرنا ہے۔ اسکے بعد حضرت نے فرمایا: استغفار کی کئی اصل ہیں' اسکے دو رکن ہیں' دو قبولیت کی شرائط ہیں اور دو کمال کی شرائط ہیں' یہ مجموعی طور پر چھ اصل بنتی ہیں۔ اب میں تمہارے لئے بیان کرتا ہوں:

فرمایا: استغفار کا اوّلین رکن یہ ہے کہ: انسان واقعی اپنے سابقہ سیاہ کردار پر شرمندہ ہو۔ دوم یہ کہ: یہ پختہ عزم کرے کہ آئندہ اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔ سوم یہ کہ: اگر لوگوں کے حقوق اسکے ذمے ہوں تو انہیں ادا کرے۔ چہارم یہ کہ: اگر اس نے خداوند عالم کے عائد کردہ فرائض کو ترک کیا ہے' تو اُن کا کی تلافی کرے' ان کی قضا ادا کرے۔

مذکورہ تین باتیں ہمارے عرائض کے لئے استدلال نہیں ہیں' ہمارے مدعا کے لئے استدلال' یہ آخری دو نکات ہیں۔

فرمایا: پنجم یہ کہ: اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری توبہ خالص ہو چکی اور واقعی ہو' تو اس گوشت کا پتا لگاؤ جو اس گناہ کے دوران اور اس گناہ کے ذریعے تمہارے اندر پیدا ہوا ہے اور اپنی توبہ اور رنج و غم سے اسے اتنا گھلاؤ کہ تمہارے بدن کی کھال ہڈیوں سے چپک جائے۔ ششم یہ کہ: تمہارا یہ بدن جو نافرمانی کا عادی ہو چکا ہے' اور جس نے لذتِ گناہ کے سوا کوئی اور لذت نہیں چکھی ہے' اسے ایک مدت تک طاعت کی مشکل اور زحمت چکھاؤ۔

کیا تاریخ میں کسی انسان نے اس انداز سے توبہ کی ہے؟

۱۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۱۷۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

جی ہاں' یہ تو آج کا دور ہے جس میں توبہ کو بھلایا جا چکا ہے اور ہم نے توبہ کرنے کو فراموش کر دیا ہے!

ابھی گزشتہ دور کے اخلاق اور سیر و سلوک کے علما میں ایک نام مرحوم آخوند ملا حسین قلی ہمدانی کا ہے۔ آپ کا شمار مرحوم میرزای شیرازی (اعلی اللہ مقامہ) اور شیخ انصاری علیہ الرحمہ کے شاگردوں میں ہوتا ہے' خود میرزای بزرگ ان کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد جو خود اکابر اور بزرگ علما میں سے تھے' تحریر کرتے ہیں کہ مرحوم آخوند کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ انہوں نے اسے توبہ کرائی۔ چند دن بعد یہ توبہ کرنے والا شخص دوبارہ آیا' تو ہم اسے بالکل پہچان ہی نہ سکے۔ اتنے مختصر عرصے میں اُس شخص کے بدن کا تمام گوشت گھل چکا تھا۔

میں اس بات کو نفسیاتی پہلو سے عرض کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں' انسان میں یہ کیا چیز ہے؟ آخوند ملا حسین قلی ہمدانی کے پاس نہ تازیانہ تھا نہ نیزے کی انی' نہ توپ اور نہ خوفزدہ کرنے والی کوئی اور چیز۔ صرف نصیحت اور رہنمائی کی قوت آپ کے پاس تھی' معنویت کی قوت کے حامل تھے۔ اس شخص کے دل اور ضمیر سے مخاطب ہونے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس آدمی کے اندر یہ کیسا وجدان پوشیدہ تھا جس نے اسے زندہ کر دیا۔ اور اس طرح خود اسے اسکے اپنے خلاف' اپنے بدن کی شہوانیت کے خلاف اور اس گوشت کے خلاف جو معصیت اور نافرمانی سے پروان چڑھا تھا ابھارا کہ جب چند روز بعد لوگوں نے اسے دیکھا' تو کہتے ہیں کہ ہم اسے پہچان نہ سکے' وہ اس قدر لاغر ہو چکا تھا۔

معنوی آزادی' انبیا کا عظیم ترین دستورِ عمل

انبیا کا سب سے عظیم دستورِ عمل معنوی آزادی ہے۔ تزکیۂ نفس دراصل معنوی آزادی ہی ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۱) ہمارے دور کا سب سے بڑا نقص یہ ہے

۱۔ بے شک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا اور وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے آلودہ کر دیا ہے۔ (سورۂ شمس ۔ آیت ۹، ۱۰)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہ ہم سب آزادی کی بات کرتے ہیں لیکن سماجی اور معاشرتی آزادی کے سوا کوئی اور بات نہیں کرتے۔ معنوی آزادی کے بارے میں تو گفتگو بھی نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں سماجی اور اجتماعی آزادی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

ہمارے زمانے میں ایک بڑا ظلم جو فلسفے اور فلسفی نظاموں کی صورت میں سامنے آیا ہے یہ ہے کہ بنیادی طور پر انسان کے بارے میں' اسکی انسانی شخصیت اور اسکی معنوی شرافت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاتی' نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایسی کسی چیز کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔

انسان ایک دو منزلہ وجود نہیں کہ جس میں ایک عالی منزل ہو اور دوسری ادنیٰ منزل۔ انسان اور حیوان کے درمیان سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے' {انسان} ایک حیوان ہے۔ زندگی تنازع بقا ہے اور تنازع بقا کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔ یعنی زندگی ہر انسان کے خود اپنے لئے جدوجہد کرنے اور اپنے مفاد کے لئے جنگ کرنے کے سوا کوئی اور چیز نہیں!

آپ جانتے ہیں اس جملے نے انسانیت پر کیسی سخت چوٹ لگائی ہے؟!

کہتے ہیں کہ زندگی جنگ اور میدانِ جنگ کے سوا کچھ اور نہیں۔ بلکہ ایک اور جملہ بھی کہتے ہیں کہ جس کے بارے میں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بہت صحیح بات ہے۔ کہتے ہیں: حق لینے والی چیز ہے' دینے والی چیز نہیں۔ {نہیں نہیں جناب!} حق لینے والی چیز بھی ہے اور دینے والی چیز بھی۔ یہ جملہ کہ حق کو فقط لینا چاہئے اور کوئی تمہیں نہیں دے گا دراصل ضمنی طور پر اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ جناب آپ کو بڑھ کر اپنا حق جھپٹ لینا چاہئے' نہ کہ آپ حق بانٹتے پھریں۔ صاحبِ حق کو خود آگے بڑھنا چاہئے' اگر طاقت ہے تو تم سے بزور اپنا حق چھین لے' اور اگر طاقت نہیں ہے تو نہیں لے سکے گا۔

لیکن انبیا یہ پیغام لے کر نہیں آئے۔ انبیا نے کہا ہے کہ حق لینے کی چیز بھی ہے اور دینے کی چیز بھی۔ یعنی انبیا مظلوم کو' پامال ہونے والے کو تلقین کرتے ہیں کہ بڑھو اور اپنا حق لے لو اور دوسری طرف ظالم کو خود اپنے خلاف قیام پر تیار کرتے ہیں' کہ ... حق ...

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس عمل میں کامیاب بھی رہے ہیں۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ: خدایا ہم تجھ سے اُن حقیقی آزاد مردوں کے واسطے جو پہلے درجے کی معنوی آزادی کے حامل ہیں سوال کرتے ہیں کہ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اپنے نفسِ امارہ سے آزاد ہو جائیں۔

خدایا! ہمیں معنوی آزادی عنایت فرما' سماجی آزادی عنایت فرما۔

ہم سب کو دنیا اور آخرت کی خیر کرامت فرما۔

خدایا! ہمیں اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔ ہم سب کی شرعی حاجات کو پورا فرما۔

خدایا! ہم سب کے مرحومین کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

رحم اللہ من قرأ الفاتحة مع الصلوات

☆......☆......☆

روح کی بزرگی اور بزرگواری☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلاة والسّلام علی عبداللّٰہ و رسوله و حبیبه و صفیه سیّدنا ونبیّنا مولانا ابی القاسم محمد(صلی اللّٰہ علیه و آله وسلم)و علی آله الطّیّبین الطّاهرین المعصومین.

اعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم:

"یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" (۱)

امام حسین علیہ السلام کی ولادت کی مناسبت سے جو محفل یہاں منعقد ہوئی تھی' اُس میں ہم نے ایک گفتگو اس بارے میں کی تھی کہ اگر کوئی شخص روح کی بزرگواری کا مالک ہو جائے' تو

☆۔ یہ تقریر ۳ شوال ۱۳۹۰ھ کو حسینیہ ارشاد تہران میں کی گئی۔

۱۔ اے نفسِ مطمئن اپنے رب کی طرف پلٹ آ اس عالم میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا (سورۂ فجر ۸۹۔ آیت ۳۰-۲۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

لازماً اُس کا بدن تکلیف و زحمت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صرف وہ بدن مکمل آرام و آسائش اور بسا اوقات لمبی عمر' انتہائی میٹھی نیند' انتہائی لذیذ کھانوں اور اسی قسم کی چیزوں سے استفادہ کرنے والے ہو سکتے ہیں جو بہت پست اور حقیر روح کے مالک ہوں۔ لیکن وہ افراد جن کی روح باعظمت ہوتی ہے' اُن کی یہی روحانی عظمت اُن کے بدن کی تکلیف اور بعض اوقات اُن کی عمر کی کمی کا سبب بنتی ہے' اُن کی جسمانی بیماریوں کا سبب ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں ہم نے کچھ گفتگو کی تھی' خاص طور پر "متنبی" کا شعر پڑھا تھا' جس میں وہ کہتا ہے کہ:

إذَا كَـانَـتِ الـنُّـفُوْسُ كِبَـارًا

تَعِبَتْ فِيْ مُرَادِهَا الْأَجْسَامُ (۱)

آج کی رات ہم روح کی بزرگی اور بزرگواری کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان اس فرق کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ روح کی بزرگی ایک چیز ہے اور روح کی بزرگواری اس سے بلند تر حقیقت۔ یعنی روح کی ہر بزرگی بزرگواری نہیں ہے۔ ہر بزرگواری' بزرگی ہے لیکن ہر بزرگی' بزرگواری نہیں ہوتی۔ اب اس بات کی وضاحت کی طرف آتے ہیں:

یہ بات ثابت شدہ ہے کہ بلند عزم وارادہ روح کی بزرگی کی علامت ہے اور پست عزم وارادہ روح کی پستی کی نشانی۔

ہمت بلند دار کہ مردانِ روزگار — از ہمت بلند بہ جائی رسیدہ اند (۲)

ایک اور کہتا ہے:

بلبل بہ باغ و جغد بہ ویرانہ تاختہ است — ہر کس بقدرِ ہمت خود خانہ ساختہ است (۳)

۱۔ جب نفوس (روحیں) عظیم ہو جاتی ہیں تو جسموں کو اپنی مراد حاصل کرنے میں تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔

۲۔ اپنا عزم وارادہ بلند رکھو کہ تاریخ کے عظیم لوگ بلند عزم وارادے ہی سے کسی مقام پر پہنچے ہیں۔

۳۔ بلبل باغ میں اور الو ویرانے کی طرف چلا جاتا ہے کہ ہر کوئی اپنے عزم وارادے کے مطابق گھر بناتا ہے۔

http://fb.com/ranajabirabbas

اور یہ بات ہر اُس راستے پر صادق آتی ہے جسے انسان اختیار کرتا ہے۔

علم ودانش کی راہ میں بلند عزم وارادہ

مثلاً علم کی راہ میں ہمتوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ ایک شخص انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پر اکتفا کر بیٹھتا ہے۔ وہ بس ایک انٹرمیڈیٹ انسان کی حد تک علم حاصل کرنا چاہتا ہے' تاکہ جاہل نہ رہ جائے۔ لیکن دوسرے کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ علم کی کسی حد پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اپنی عمر سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور اپنی عمر کے آخری لمحے میں بھی علمی مسائل کے حصول اور اُن کے انکشاف میں کوتاہی نہ کرے۔ آپ نے ابوریحان البیرونی کا مشہور واقعہ سنا ہوگا' اُن کے بارے میں محققین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ آج بھی اُن کی قدر و قیمت پوری طرح سامنے نہیں آسکی ہے۔ یہ فلسفی' ریاضی دان' معاشرہ شناس اور مورخ غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ بعض لوگ انہیں بوعلی سینا پر فوقیت دیتے ہیں۔ البتہ اگر بعض پہلوؤں کو مدِنظر رکھیں تو یقینی طور پر ابوریحان البیرونی کو بوعلی سینا پر ترجیح حاصل ہے' اسی طرح جیسے بعض دوسرے پہلوؤں میں بوعلی کو ابوریحان پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم عصر بھی ہیں۔

ابوریحان علم ودانش' تحقیق اور نئے نئے انکشافات کے دلدادہ تھے۔ سلطان محمود نے انہیں زبردستی اپنے پاس بلالیا تھا۔ وہ چلے گئے تھے لیکن ہر باہمت شخص کی طرح ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ سلطان محمود نے ہندوستان کو فتح کیا تو وہ اس کے ساتھ ہندوستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو معلومات اور علوم کا ایک خزانہ موجود ہے لیکن وہ سنسکرت زبان سے ناآشنا تھے۔ وہ اپنے بڑھاپے کے باوجود اعلیٰ درجے پر اس زبان کو سیکھتے ہیں۔ وہاں سالہا سال مطالعے کے بعد ایک کتاب لکھتے ہیں جس کا نام "تحقیق ما للهند من مقولة مرذولة في العقل او مقبولة" ہے۔ آج یہ کتاب ہندشناسی کی انتہائی اہم بنیادی کتاب شمار کی جاتی ہے۔

جس زمانے میں ابوریحان البیرونی مرض الموت میں گرفتار اور حالتِ احتضار میں تھے' ان کے ہمسائے میں رہنے والے ایک فقیہ کو معلوم ہوا کہ البیرونی اس حالت میں ہیں تو وہ ان کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

عیادت کے لئے آئے۔ وہ ہوش میں تھے۔ جوں ہی ان کی نظر فقیہ پر پڑی انہوں نے ان سے وراثت یا کسی اور موضوع پر ایک فقہی مسئلہ دریافت کیا (۱) فقیہ نے تعجب کیا اور اعتراض کرتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ اس وقت جبکہ آخری سانسیں لے رہے ہیں' مجھ سے مسئلہ پوچھتے ہیں؟!

ابو ریحان نے جواب دیا: میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں: اگر میں مرجاؤں (یہ نہیں کہا کہ میں جانتا ہوں کہ میں عنقریب مرجاؤں گا) اور جان لوں تو یہ بہتر ہے یا مرجاؤں اور نہ جانتا ہوں یہ بہتر ہے؟ اس نے کہا: ہاں' جان کر مرنا (بہتر ہے)۔ ابو ریحان نے کہا: اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں۔ فقیہ کا کہنا ہے کہ میرے اپنے گھر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد صدا بلند ہوئی کہ ابو ریحان کا انتقال ہوگیا ہے! مجھے ان کے اہل وعیال کے رونے کی آواز سنائی دی۔

اسے کہتے ہیں ایک بزرگ آدمی جو علم و دانش کے حصول کے سلسلے میں ایک بلند عزم وارادے کے مالک تھے۔

مال و دولت جمع کرنے کے سلسلے میں بلند عزم وارادہ

دوسرا مثلاً مال و دولت جمع کرنے کے سلسلے میں بلند عزم وارادے کا مالک ہوتا ہے۔

کیا مال و دولت جمع کرنے کے سلسلے میں لوگوں کا عزم وارادہ ایک سا ہوتا ہے؟

بعض لوگوں میں مال و دولت جمع کرنے کی معمولی سی آرزو بھی نہیں ہوتی۔ اُن کی تمنا صرف اتنی ہوتی ہے کہ اُن کا پیٹ بھر جائے۔ انہیں روٹی مل جائے' چاہے اس کے لئے کسی کی نوکری ہی کرنا پڑے چاہے بھیک مانگ کر حاصل ہو' چاہے ذلت اٹھا کر ملے۔ لیکن دوسرا چاہتا ہے

۱۔ ابو ریحان کی کتابوں سے پتا چلتا ہے اور محققین کی طرف سے لکھی گئی اُن کی سوانح حیات میں بھی تحریر ہے کہ وہ ایک انتہائی باایمان اور پختہ عقیدہ رکھنے والے مسلمان تھے۔ جو کتابیں انہوں نے دینی فنون پر نہیں بھی لکھی ہیں' جیسے "الآثار الباقیۃ" وغیرہ تو ان میں بھی جہاں اسلام' قرآن اور اسلامی احکام کی بات آتی ہے' وہاں بوعلی کی طرح انتہائی مودبانہ' مومنانہ اور عقیدتمندانہ انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں کہ انسان کو اُن کے اخلاص کے بارے میں [illegible]

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہ اس کے پاس مال و دولت ہو' چاہتا ہے کہ اپنے گرد دولت کے انبار لگا لے۔

اب کیا دولت جمع کرنے کے خواہشمند لوگ باہم مساوی ہیں؟ ہرگز نہیں۔

بعض لوگوں میں دولت جمع کرنے کی خواہش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ کم (مال و دولت) پر مطمئن نہیں ہوتے۔ یہ نکتہ بھی عرض کرتے چلیں کہ بسا اوقات بعض بے ہمت لوگ صرف اس لئے کہ اُن میں صلاحیت ہی نہیں ہوتی' اس لئے کہ اُن میں دم ہی نہیں ہوتا' اس لئے کہ اُن میں مردانگی ہی نہیں ہوتی' جب وہ کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو مال و دولت جمع کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے' تو اُس کی تحقیر کرتے ہیں' اُس پر ہنستے ہیں' (اس کے لئے) زہد سے متعلق آیات قرآنی پڑھتے ہیں' زہد اور تقویٰ کی باتیں کرنے لگتے ہیں

(ایسے لوگ) مغالطہ کرنا چاہتے ہیں۔

نہیں جناب! جو شخص مال و دولت کے حصول میں لگا ہوا ہے' وہ چاہے لالچ اور دنیا پرستی کی وجہ سے اس عمل میں مصروف ہو' وہ تم سے جو پست ہمت' بے ہمت اور بھکاری صفت ہو' بہتر ہے' وہ تم سے زیادہ عزت وآبرو کا حامل انسان ہے۔

ایسا شخص اپنے سے زیادہ ہمت رکھنے والے شخص کے مقابل مذموم ہے۔ ایک حقیقی زاہد شخص جو باہمت ہوتا ہے' وہ اُس کی مذمت کرسکتا ہے' جیسے علی' جو مرد عمل ہیں' جو مال و دولت پیدا کرنے والے ہیں' لیکن (اُس کے) لالچی اور اس پر حریص نہیں ہیں' اُسے اپنے لئے بچا کر نہیں رکھتے ہیں' اپنے آپ کو روپے پیسے سے وابستہ نہیں کرلیتے۔ وہ روپیہ پیسا کماتے ہیں' لیکن کس لئے؟ خرچ کرنے کے لئے' (دوسروں کی) مدد کرنے کے لئے۔ ایسے شخص کو حق حاصل ہے کہ اُس (شخص) کی مذمت کرے اور کہے کہ: اے لالچی! اے حریص! اے وہ جس میں ہمت ہے' عزم ہے' ارادہ ہے' تیرے اندر ولولہ پایا جاتا ہے' تیرے اندر طاقت پائی جاتی ہے! کیوں تو اپنی طاقت کو مال و دولت جمع کرنے میں خرچ کرتا ہے؟ کیوں تیرے لئے مال و دولت مقصد بن گیا ہے؟ مال و دولت کو تیرے لئے وسیلہ ہونا چاہئے۔

لیکن میں' بے ہمت' پست نگاہ جو اس مال و دولت [illegible] کر [illegible] کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

ہاتھ سے لے لیتا ہوں (ایسے شخص کا ہاتھ چومتا ہوں' اُس کے قدموں کے بوسے لیتا ہوں جو اپنی دولت کا ایک ہزارواں یا دس لاکھواں حصہ مجھے دیتا ہے) مجھے اس شخص پر تنقید کا حق نہیں۔

حصولِ جاہ و مقام کے لئے بلند عزم و ارادہ

ایک اور شخص' جاہ طلبی' بڑائی اور عہدے و منصب کا متمنی ہوتا ہے۔

کیا لوگ اس اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں؟

نہیں!

اس بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر ایک بلند ہمت انسان تھا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جس کے ذہن میں یہ سودا سما گیا تھا کہ وہ پوری دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرے گا۔

سکندر ایک ایسے نوکر صفت انسان سے کہیں بلند ہے جس میں سرے سے سرداری اور آقائی کی حس ہی نہیں پائی جاتی' اس میں برتری چاہنے کا احساس موجود نہیں ہوتا' اس میں اس کی امنگ ہی نہیں ہوتی۔ نادر شاہ اور اس جیسے لوگ بھی ایسے ہی ہیں۔ انہیں بزرگ روحیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن بزرگوار روحیں نہیں کہا جا سکتا۔ سکندر ایک بہت بڑا جاہ طلب انسان تھا' ایک بزرگ روح تھا' لیکن (اس) بزرگ روح نے اس میں کس چیز کو پروان چڑھایا ہے؟ وہ شاخ جو اس روح میں پروان چڑھی ہے' وہ کیا ہے؟

جب ہم اس کے وجود میں جھانکتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ یہ روح تو بزرگ ہو گئی ہے' لیکن وہ شاخ جو اس کے اندر بڑھی ہے' وہ جاہ طلبی ہے' شہرت ہے' اثر و رسوخ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قوت بن جائے' وہ چاہتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا فاتح بن جائے' وہ چاہتا ہے کہ دنیا کا غالب ترین انسان بن جائے۔ یہ روح بزرگ ہے لیکن جاہ طلبی کے اعتبار سے۔

اس کا بدن بھی سکون و راحت نہیں پاتا۔ کیا سکندر کے بدن کو دنیا میں آرام نصیب ہوا؟ کیا سکندر یہ کر سکا کہ وہ سکندر بھی بن جائے اور اس کا بدن بھی سکھ اور آرام سے رہے؟ کیا نادر شاہ' وہی ظالم نادر شاہ' وہی نادر شاہ جو کھوپڑیوں کے مینار بناتا تھا' وہی نادر شاہ جو (لوگوں کی) آنکھیں

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نکال دیا کرتا تھا' وہی نادر شاہ جو ایک بہت بڑا جاہ پرست دیوانہ تھا' کیا وہ نادر بننے کے باوجود اپنے بدن کو آسائش فراہم کر سکا تھا؟ کبھی کبھی تو دس دس دن تک اس کا جوتا اُسکے پیروں سے نہیں اترتا تھا' دراصل اُسے جوتا اتارنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ نادر شاہ اسی "زیدر گھاٹی" میں ایک کارواں سرا کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ سرائے کا مالک کہتا ہے کہ آدھی رات کا وقت تھا' کسی نے سرائے کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ جوں ہی میں نے دروازہ کھولا' ایک قوی ہیکل آدمی' ایک بہت بڑے طاقتور گھوڑے پر سوار اندر آ گیا' آتے ہی پوچھنے لگا: کھانے میں کیا ہے؟ میرے پاس انڈوں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ اس نے کہا: بہت سے انڈے تیار کرو۔ میں نے اُس کے لئے (انڈے) تیار کئے' پکائے۔ اس نے کہا: روٹی لے آؤ' میرے گھوڑے کے لئے بھی جو لے آؤ۔ میں نے یہ ساری چیزیں اُسے فراہم کیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کی مالش کی' اسکے ہاتھ پاؤں اور بدن پر ہاتھ پھیرا۔ وہ وہاں دو گھنٹے رہا' معمولی سی نیند بھی لی۔ جب جانے لگا تو جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر اشرفیاں نکالیں اور کہا: اپنا دامن پھیلاؤ۔ میں نے اپنا دامن پھیلایا' تو اس نے وہ اشرفیاں میرے دامن میں ڈال دیں۔ پھر کہنے لگا کہ ابھی کچھ ہی دیر بعد ایک لشکر یہاں پہنچے گا۔ جب وہ آئے تو اُس سے کہنا کہ نادر نے کہا ہے کہ میں فلاں جگہ چلا گیا ہوں' فوراً میرے پیچھے چلے آئیں۔ (کارواں سرا کا مالک) کہتا ہے کہ: جوں ہی میں نے سنا "نادر" میرا ہاتھ لرز گیا اور دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُس نے کہا: تم جا کر چھت پر کھڑے ہو جانا' جوں ہی وہ پہنچیں' اُن سے کہنا کہ بلا توقف میرے پیچھے چلے آئیں (خود وہ رات میں اپنی فوج سے دو گھنٹے قبل حرکت کیا کرتا تھا) نادر شاہ کی فوج پہنچی تو میں نے اوپر سے چیخ کر کہا کہ: نادر شاہ نے حکم دیا ہے کہ پڑاؤ فلاں جگہ پر ڈالا جائے گا۔ وہ بڑبڑائے لیکن کسی ایک میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ نہ جاتا' سب چلے گئے۔

اگر انسان نادر شاہ بننا چاہتا ہے تو وہ اپنی خوابگاہ میں نرم بستر پر نہیں سو سکتا ہے' بہترین غذائیں نہیں کھا سکتا۔ سرداری کا متمنی' جاہ پرست' ریا[illegible] انسان ایک [illegible] ظالم

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہی کیوں نہ ہو اُس کے بدن کو آسائش میسر نہیں آ سکتی' آخر کار مارا بھی جا سکتا ہے۔

کوئی بھی انسان' کسی بھی شعبے میں بلند عزائم کا مالک ہو روح کی بزرگی کا حامل ہو اُسے تن آسانی میسر نہیں ہوتی۔ لیکن جن افراد کے متعلق ہم نے عرض کیا' اُن میں سے کوئی ایک بھی روح کی بزرگواری کا حامل نہ تھا۔ ان کی روح بزرگ تھی' لیکن بزرگوار نہیں تھی۔

بزرگی اور بزرگواری کے درمیان کیا فرق ہے؟

فرض کیجئے ایک شخص ایک بڑا عالم ہو اور علم کے سوا کوئی اور فضیلت نہ رکھتا ہو۔ یعنی ایسا انسان ہو جو صرف ایک نیا انکشاف' ایک نئی تحقیق کرنا چاہتا ہو۔ ایسا انسان ایک بڑا مفکر اور مدبر ہے۔ یعنی علم کی راہ میں بلند عزم و ارادے کا حامل انسان ہے۔ (جبکہ) وہ دوسرا شخص ایک بڑا افزوں طلب انسان ہے' جو ہمیشہ حصولِ دولت کی فکر میں رہتا ہے۔ اُس نے مال و دولت کو اپنا مقصد قرار دیا ہوا ہے' انتہائی شہوت پرست ہے' انتہائی حریص ہے۔ ایک اور ہے جس میں انتہائی درجے کی رقابت پائی جاتی ہے۔ ایک اور ہے جو انتہائی کینہ پرور ہے۔ ایک اور ہے جو انتہائی درجے کا حاسد ہے۔ ایک اور میں انتہائی جاہ طلبی پائی جاتی ہے۔ یہ تمام کی تمام بڑی خود پرستیاں ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی بزرگواری نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بزرگی ہیں لیکن بزرگواری نہیں۔

بزرگواری

ایک مسئلہ جو نفسیاتی اور فلسفی اعتبار سے انتہائی قابلِ توجہ ہے' وہ یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنی روح میں اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اپنی فطرت میں پائی جانے والی اس قسم کی بزرگیوں کے علاوہ' جو بڑی بڑی خود پرستیوں سے جا ملتی ہیں' اپنے وجود میں ایک اور طرح کی بزرگی کا احساس بھی رکھتا ہے' جس کا تعلق ان اقسام سے نہیں ہے۔ انہیں انسانیت بزرگ کہنا چاہئے۔

میں اب تک سمجھ نہیں سکا ہوں کہ یہ مادہ پرست اصحاب' میٹریلسٹ لوگ کس طرح اس کی توجیہ کر سکتے ہیں؟

آخر یہ انسان یا کم از کم بعض انسانوں میں پایا جانے والا کیسا احساس ہے۔ البتہ یہ احساس

تمام افرادِ بشر میں پایا جاتا ہے لیکن بعض میں اس احساس کی شمع بجھی ہوئی ہے' یا اس کی لو انتہائی مدھم ہے اور بعض میں مکمل طور پر فروزاں بھی ہے۔ (اس احساس کی بنا پر) انسان اپنی روح میں ایک عزت و سربلندی کا احساس رکھتا ہے' یعنی عزت و سربلندی کی صورت میں ایک بزرگی سی محسوس کرتا ہے؟

ایسا انسان ایک بڑا انسان ہے نہ کہ ایک بڑا خود پرست' خود پرستی سے بالاتر ہے۔ یہ انسان ایک احساسِ عزت کی وجہ سے خود پرستی کو قدموں تلے روند ڈالتا ہے۔

کیسے؟

یہ انسان بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ لیکن اس فکر میں نہیں ہوتا کہ فلاں آدمی سے بڑا بن جاؤں۔ فلاں آدمی کے پاس اتنی دولت ہے' میرے پاس اس سے زیادہ ہونی چاہئے۔ فلاں آدمی کو صرف میرے حکم کا اطاعت گزار ہونا چاہئے' میں حکم دوں اور وہ اطاعت کرے۔ مجھے حاکم ہونا چاہئے اور اسے محکوم۔ (بلکہ وہ) برائیوں کے مقابل اپنے نفس اور اپنی روح کے لئے عزت و بزرگی کا احساس رکھتا ہے۔ مثلاً ایک ایسا انسان جسے اس کی روح ہی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دیتی' وہ بنیادی طور پر جھوٹ کو پستی اور کمینگی سمجھتا ہے' وہ اپنی روح میں احساسِ عزت و سربلندی رکھتا ہے۔ اس کا یہ احساس پستی اور حقارت کے مقابل بزرگی ہے۔ یہ بزرگی جسے بزرگواری کہتے ہیں پستی اور حقارت کے مقابل ہے۔ انسان اپنی روح میں بزرگواری کا احساس رکھتا ہے۔ یعنی اپنے اندر ایک ایسی عظمت محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ پستی میں پڑنے سے اجتناب کرتا ہے۔

(جبکہ) اُس جاہ پرست انسان کی نظر میں جاہ پرستی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اگر زندگی ہے تو یہ ہے کہ انسان شیر کی طرح زندگی بسر کرے نہ کہ بھیڑ کی طرح۔ یعنی دوسرے کو پھاڑ کھائے نہ کہ دوسرا اس کو چیر ڈالے۔

مسولینی (اٹلی کے مشہور آمر) نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا: میں سو سال بھیڑ کی طرح زندگی گزارنے پر ایک سال شیر کی طرح زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک سال شیر بنوں' دوسروں کو پھاڑ کھاؤں اور انہیں اپنا لقمہ بناؤں' اس سے [illegible] کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

شیر کا لقمہ بننے کے لئے تیار رہوں۔ اُس نے یہ کہا اور باقاعدگی سے ایک رقم اپنے اس دوست کو دیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں میرے اس قول کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں اس وقت شیر بن سکتا ہوں جب لوگ بھیڑ بن جائیں' لیکن اگر لوگوں کو یہ جملہ پتا چل گیا' تو وہ بھی مسولینی کی طرح بننا چاہیں گے' میری طرح شیر بننا چاہیں گے۔ ایسی صورت میں میں شیر نہیں رہ سکوں گا۔ انہیں بھیڑ رہنا چاہئے تاکہ میں شیر رہوں۔ اس شخص میں بزرگی تھی لیکن بزرگواری نہیں۔

بزرگوار کیسا ہوتا ہے؟

بزرگوار چاہتا ہے کہ سب لوگ شیر بن جائیں۔ یعنی کوئی بھیڑ نہ رہے کہ دوسرا اسے چٹ کر جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں سرے سے درندگی باقی ہی نہ رہے۔ یہ ہے احساسِ بزرگواری' احساسِ انسانیت اور قرآن کی تعبیر میں احساسِ عزت' احساسِ کرامت نفس۔ اسلامی منابع میں "کرامت" کا لفظ بہت استعمال ہوا ہے اور بزرگواری ہی کا مفہوم دیتا ہے۔

کلامِ پیغمبر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک جملہ ہے کہ آپ نے فرمایا: اِنّی بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (۱) میں نے بارہا کہا ہے کہ بسا اوقات اس جملے کا غلط ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ نہیں ایہ (اس جملے کا) مکمل ترجمہ نہیں ہے' پیغمبر نے اس سے بڑھ کر فرمایا ہے۔ اگر پیغمبر نے یہ کہا ہوتا کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں' تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر مکتب کا بانی' وہ جس قسم کا بھی اخلاق لایا ہو' اُس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اچھا اخلاق وہی ہے جو میں کہتا ہوں۔ وہ مکتب جو پستی اور دنائت کا حکم دیتا ہے' وہ بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اچھا اخلاق یہی ہے۔ کوئی اور مثلاً "نطشے" جس کا کہنا ہے کہ انسان کو طاقت پر بھروسہ کرنا چاہئے' کمزوری سے بڑھ کر

۱۔ المحجۃ البیضاء، ج۵، ص۸۹

کوئی گناہ نہیں ہے' کمزور پر رحم نہ کرو اور نہ اس کی مدد کرو۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ اچھا اخلاق یہی ہے جو میں کہتا ہوں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف اچھے اخلاق کے بارے میں فرمان دیا ہے بلکہ اپنے مکتب کی رو سے اچھائی کی تعریف بھی کی ہے۔ میں صرف اچھائی کی تلقین نہیں کرتا (اچھائی کرنے کو تو سب کہتے ہیں' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) "اِنّی بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" میں مبعوث ہوا ہوں تاکہ ایسے اخلاق کی تکمیل کروں' جس میں روحِ مکرمت ہے' یعنی بزرگواری کا اخلاق' آقائی کا اخلاق۔ لیکن وہ آقائی نہیں جس میں دوسروں پر مسلط ہو جاؤں' بلکہ ایسی آقائی جس میں میری روح آقا ہو اور (وہ) پستی' دنائت' جھوٹ' غیبت اور تمام صفاتِ رذیلہ سے اجتناب کرے' اپنے آپ کو ان چیزوں سے برتر اور بالاتر سمجھے۔

اس حوالے سے ہمارے پاس اسلامی منابع میں الی ماشاء اللہ بہت کچھ پایا جاتا ہے۔

حضرت علی کے اقوال

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"اَکْرِمْ نَفْسَکَ عَنْ کُلِّ دَنِیَّۃٍ وَ اِنْ سَاقَتْکَ اِلَی الرَّغَائِبِ فَاِنَّکَ لَنْ تَعْتَاضَ بِمَا تَبْذُلُ مِنْ نَفْسِکَ عِوَضاً۔" (۱)

بیٹا! اپنی روح کی عزت کرو' بزرگوار رکھو' ہر پست عمل سے برتر رکھو۔ ہر پستی کے مقابل یہ سمجھو کہ میری روح ان پستیوں میں آلودہ ہونے سے بالاتر ہے۔ بالکل ایک ایسے شخص کی طرح جس کے پاس ایک بہت اعلیٰ پائے کی پینٹنگ ہو اور جب اس پر کوئی سیاہ داغ ابھرے' اس پر کوئی گرد و غبار نظر آئے' تو وہ فوراً از خود رومال اٹھا کر اسے صاف کر دیتا ہو۔ اگر اس سے کہتے ہیں کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ کیا اس پائے کی پینٹنگ پر ایسا سیاہ داغ قابلِ افسوس نہیں ہے؟!

۱۔ اپنے نفس کو ہر ذلت سے بلند تر سمجھو اگرچہ وہ ذلت تمہیں تمہاری خواہشات تک پہنچا دے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں تم اپنے نفس کی جس عزت سے محروم ہو گے اس کا کوئی بدل نہیں [illegible]

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact: jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ پینٹنگ اس قدر اعلیٰ اور خوب صورت ہے کہ اس پر ایک بھی سیاہ داغ کی موجودگی افسوس ناک بات ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اپنی روح میں ایسی خوش نمائی کا احساس کرو، عظمت کا احساس کرو، سربلندی کا احساس کرو کہ ہر قسم کے مقصد، ہر قسم کے خیال اور ہر مادّی حاجت سے قطع نظر اپنے آپ کو پستی میں گرا لینے سے بزرگ تر سمجھو۔ اگر جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑے تو جھوٹ پستی ہے، دنائت ہے۔ تم صاحبِ مرتبت ہو، تم بزرگوار ہو، تم عالی ہو، تم خوب صورت ہو، اپنے آپ کو جھوٹ بول کر کمتر اور پست کرنے سے برتر سمجھو۔ کوئی چیز لوگوں سے نہ مانگو، لوگوں سے مانگنا پستی ہے، تم بزرگ ہو، بزرگوار ہو، خوب صورت ہو۔ تم انسان ہو، مقامِ انسانیت کے شایانِ شان نہیں کہ انسان دوسرے کے سامنے جھک کر اپنی حاجت طلب کرے۔ فرمایا: اَلتَّقَلُّلُ وَ لَا التَّوَسُّلُ. کم پر قناعت کرو اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔

خصوصاً اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام کے کلمات بہت زیادہ ہیں۔ حضرت علی کا ایک عجیب جملہ ہے، فرماتے ہیں: مَا زَنٰی غَیُوْرٌ قَطُّ. یعنی شرافت مند انسان کبھی زنا نہیں کرتا، ایک غیرت مند انسان ہرگز زنا نہیں کرتا۔ یہ اس سے قطع نظر ہے کہ زنا شرعی طور پر حرام ہے یا حرام نہیں ہے، اس سے قطع نظر ہے کہ خدا روزِ قیامت زنا کار انسان کو عذاب دے گا یا نہیں۔ فرماتے ہیں: ایک شریف آدمی، ایک غیور انسان، ایک ایسا انسان جس میں احساسِ عظمت پایا جاتا ہے، جو اپنی روح میں عزت و سربلندی کا احساس رکھتا ہے، وہ ہرگز زنا نہیں کرتا۔

نہج البلاغہ میں ایک ولولہ انگیز جملہ ہے اور اسے سن کر ایک مسلمان کے دل میں ولولہ پیدا ہونا چاہئے۔ معروف قصہ ہے اور لازماً آپ نے سنا ہوگا۔ صفین میں جب حضرت علی کا لشکر پہلی مرتبہ معاویہ کے لشکر کے مقابل آیا تو امیر المومنین کا خیال تھا کہ جنگ شروع نہ کی جائے، خطوط کا تبادلہ ہو، ایک دوسرے کے نمائندوں کی آمد و رفت ہو تاکہ یہ اختلاف حل ہو جائے اور مسلمان ایک دوسرے پر تلوار نہ چلائیں۔ جب معاویہ اور ان کے ساتھی پہنچے تو انہوں نے اپنے خیال میں سبقت کر [illegible] قبضہ کرلیا، تاکہ جب وہاں امیر المومنین کا لشکر پہنچے تو پانی ان کی

دسترس میں نہ ہو اور وہ بے آبی کی مشکل میں گرفتار ہو جائیں اور اس طرح ان کو شکست ہو جائے۔

جب امیر المومنین وہاں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ انہوں نے یہ حرکت کی ہے۔ آپ نے ایک خط لکھا، کسی کو بھیجا اور پیغام دیا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ ہم نے ابھی ایک دوسرے سے جنگ شروع نہیں کی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بات کرنے آئے ہیں، سفیر بھیجیں، ملاقاتیں کریں، شاید اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے مابین تنازع ختم کر دے اور جنگ نہ ہو۔ لیکن معاویہ کسی صورت تیار نہ ہوئے اور کہا کہ: ہمیں جو موقع ملا ہے، ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ امیر المومنین نے متعدد مرتبہ یہ عمل دہرایا، آپ نے کئی مرتبہ (ہمارے الفاظ میں یہ کہا کہ) یہ شیطانی حرکتیں چھوڑ دو، ہم بغیر پانی کے نہیں رہ سکتے، اگر یہ صورتحال ایک یا دو دن مزید جاری رہی اور ہمارے پاس پانی ختم ہو گیا، تو ہم تلوار اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ گفتگو اور مذاکرات کا موقع باقی رہے۔ لیکن معاویہ کے یہاں سے جواب آیا کہ: یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

یہ صورتحال دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام نے محسوس کر لیا کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لائے اور اپنے اصحاب سے ایک مختصر خطاب فرمایا۔ دیکھئے یہ زاہد علی، یہ عابد علی، یہ متقی اور پرہیزگار علی، یہ اہلِ آخرت علی، اس علی کی روح کس قدر پُرجوش ہے، اس میں کس قدر عظمت پائی جاتی ہے، انسانی عظمت کی کس قدر حفاظت کرتی ہے! (ہمارے یہاں کے زاہد نماؤں کے برخلاف) فرماتے ہیں: قَدِ اسْتَطْعَمُوْکُمُ الْقِتَالَ (ایک پُرجوش خطاب ہے) اے میرے جوانو! اے میرے سپاہیو! یہ لوگ تم سے ایک خوراک کی مانند جنگ کے طلبگار ہیں، ایک خوراک کی طرح تم سے تلواریں مانگ رہے ہیں، یہ جنگ چاہتے ہیں۔ پھر فرمایا: رَوُّوا السُّیُوْفَ مِنَ الدِّمَاءِ تَرْوَوْا مِنَ الْمَاءِ. اب جب کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو جانتے ہو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اے میرے سپاہیو! تم پیاسے ہو؟ صرف ایک راستہ ہے (اور وہ یہ کہ) اپنی تلواروں کو ان نجس لوگوں کے خون سے سیراب کرو تاکہ تم خود سیراب ہو سکو۔ پھر فرمایا: فَالْمَوْتُ فِیْ حَیَاتِکُمْ مَقْهُوْرِیْنَ وَالْحَیَاةُ فِیْ مَوْتِکُمْ قَاهِرِیْنَ (۱)

۱۔ وہ تم سے جنگ کے نوالے طلب کرتے ہیں تو اب یا تو تم ذ[illegible] (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

(میں نہیں سمجھتا کہ کسی بھی جنگی تقریر میں ایسا ہیجان انگیز اور بلیغ مختصر جملہ مل سکے گا) زندگی کے کیا معنی ہیں؟ کھانا' پینا' سونا' چلنا پھرنا زندگی نہیں ہے۔ اگر آپ مر کر فتح حاصل کر لیں' تو آپ زندہ ہیں۔ لیکن اگر دشمن سے مغلوب ہو کر زندہ رہیں' تو جان لیں کہ آپ مردہ ہیں۔

اس طرح حضرت علی نے اپنے اصحاب میں عزت اور کرامت کی روح پھونکی۔

اِن حوالوں سے امیر المومنین علیہ السلام کے اور جملے بھی ہیں' جن میں سے بعض کو ہم آپ کی خدمت میں بیان کریں گے۔ مجموعی طور پر امیر المومنین نفس کی پستی کو تمام برے اخلاق کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی پستی اور دنائت کو تمام اخلاق رذیلہ کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ مثلاً غیبت کے باب میں فرماتے ہیں: اَلْغِیبَةُ جُهْدُ الْعَاجِزِ۔ (۱) بے بس' ناتوان' کم ہمت اور پست لوگ غیبت کیا کرتے ہیں۔ ایک مرد' ایک بہادر' ایک ایسا شخص جو اپنی روح میں عزت اور شرافت کا احساس رکھتا ہے' وہ اگر کسی پر تنقید کرنا چاہتا ہے' تو اس کے منہ کے سامنے کرتا ہے یا کم از کم اس کے سامنے سکوت اختیار کرتا ہے۔ اب یہ کہ کچھ لوگ تعریف اور چاپلوسی کرتے ہیں' یہ ایک الگ بات ہے۔ اس کے پیٹھ موڑتے ہی اس کی برائی اور غیبت شروع کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ عاجز و ناتواں لوگوں کی زیادہ سے زیادہ ہمت ہے' کمزوروں کا دم درود یہی ہے' یہ پستی اور دنائت ہے۔ جو انسان اپنے اندر عزت و شرافت محسوس کرتا ہے' وہ غیبت نہیں کرتا۔

اسی طرح فرماتے ہیں:

" اَزْرَىٰ بِنَفْسِهِ مَنِ اسْتَشْعَرَ الطَّمَعَ ' وَ رَضِيَ بِالذُّلِّ مَنْ كَشَفَ ضُرَّهُ '
وَ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ مَنْ اَمَّرَ عَلَيْهَا لِسَانَهُ. "(۲)

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) اور حقارت پر سر تسلیم خم کر دو یا تلواروں کی پیاس خون سے بجھا کر پانی سے اپنی تشنگی دور کر لو۔ تمہارا ان سے دب جانا جیتے جی موت ہے اور غالب آ کر مرنا جینے کے برابر ہے۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۵۱)

۱۔ کمزور کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔ (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۶۱)

۲۔ جس نے طمع کو اپنی عادت بنایا اس نے اپنے آپ کو سبک کیا' جس نے اپنی پریشان حالی کا اظہار کیا وہ ذلت پر آمادہ ہو گیا' اور جس نے اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھا اس نے خود اپنی بے وقعتی کا سامان کر لیا۔ (نہج البلاغہ

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جس شخص نے دوسروں سے لالچ کو اپنا شعار بنایا' اس نے اپنے آپ کو سبک اور حقیر کر لیا' خود کو پست تر کر لیا۔ یعنی جو انسان اپنے بارے میں عظمت کا احساس رکھتا ہے' محال ہے کہ وہ دوسروں سے لالچ رکھتا ہو۔ جو شخص دوسروں کے سامنے اپنی پریشانیاں اور مشکلات بیان کرتا ہے' وہ یہ بات جان لے کہ اُس نے ذلت کو قبول کر لیا ہے۔ ایک باشرف انسان' ایک ایسا شخص جو انسانیت اور عزت کا احساس رکھتا ہے' وہ کبھی اپنی تکالیف دوسروں کے سامنے بیان کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنا دکھ درد برداشت کر لیتا ہے لیکن دوسروں سے بیان نہیں کرتا۔

ایک شخص امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی تنگ دستی کا ذکر کرنے لگا کہ میں بہت غریب ہوں' انتہائی مفلس ہوں' میری آمدنی سے میرا خرچ پورا نہیں ہوتا' میں ایسا کرتا ہوں' میں ویسا کرتا ہوں۔ حضرت نے اپنے ایک آدمی سے فرمایا: جاؤ فلاں مقدار میں دینار لا کر اسے دے دو۔ جب وہ (رقم) لینے کے لئے چلا گیا تو اُس شخص نے کہا: مولا! خدا کی قسم' میرا مقصد آپ سے کچھ مانگنا نہیں تھا۔ امام نے فرمایا: میں نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان باتوں سے تمہارا مقصد مجھ سے کچھ طلب کرنا تھا۔ البتہ میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں' تمہیں میری نصیحت یہ ہے کہ تمہیں جو بھی مشکل' پریشانی اور سختی پیش آئے' اُسے لوگوں کے سامنے بیان نہ کرو' کیونکہ اس طرح تم (لوگوں کے سامنے) حقیر ہو جاؤ گے۔ اسلام کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ مومن دوسروں کی نظر میں حقیر ہو جائے۔ مصنوعی طریقے سے بھی اپنی عزت کی حفاظت کرو۔

حضرت علی علیہ السلام کا بھی فرمان ہے کہ: رَضِيَ بِالذُّلِّ مَنْ كَشَفَ ضُرَّهُ. ایسا شخص جو دوسروں سے اپنا درد اور اپنی پریشانیاں بیان کرتا ہے' وہ اپنی عزت و آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہر جگہ کہتا پھرتا ہے' جناب میں بہت پریشان ہوں' میری حالت بہت خراب ہے' میرے حالات آج کی اصطلاح میں انتہائی ڈرامائی ہیں' ایسا ہے' ویسا ہے۔ یہ باتیں نہ کیا کرو۔ عزت و آبرو ہر چیز سے بڑھ کر ہے' مومن کی عزت ہر چیز سے زیادہ گراں قیمت ہے۔

وَ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ مَنْ اَمَّرَ عَلَيْهَا لِسَانَهُ. ایسا شخص جو اپنی نفسانی خواہش کو اپنے اوپر مسلط کر لے' ایسا شخص جو اپنی شہوت کا تابع اور نفسانی خواہش کا پجاری ہو' اسے یہ بات جان

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

لینی چاہئے کہ اس نے اپنی پہلی توہین خودی کی ہے' خود کو پست کیا ہے۔ شہوت پرستی ایک قسم کی پستی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے نکتۂ نظر سے بنیادی طور پر تمام اخلاقی رذائل ایک لفظ میں جمع ہوجاتے ہیں اور وہ ہے" روح کی پستی" اس کا بزرگوار نہ ہونا۔ اور علی تمام اخلاقی فضائل کو ایک لفظ میں جمع کرتے ہیں اور وہ" روح کی بزرگواری" ہے۔

اپنی روح میں بزرگواری کا احساس کیجئے' آپ دیکھیں گے کہ راست گو ہیں' دیکھیں گے کہ امانتدار ہیں' دیکھیں گے کہ ثابت قدم ہیں۔ اپنی روح میں بزرگواری کا احساس کیجئے' آپ دیکھیں گے کہ آپ بردبار ہیں' بلند طبع ہیں' غیبت نہیں کرتے ہیں' کوئی پست کام نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً شراب نہیں پیتے ہیں' کیونکہ شراب پینے سے نشہ چڑھتا ہے' اور نشہ (چاہے وقتی طور پر ہی کی) انسان سے عقل کو چھین لیتا ہے' جس کے نتیجے میں اس کا وقار اور اعتبار جاتا رہتا ہے۔ اگر ایک عارضی وقت کے لئے بھی انسان سے اُس کی انسانیت سلب ہوجائے' تو وہ ایک بے عقل حیوان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

(امیر المومنین نے) ایک اور جملے میں فرمایا ہے: اَلْمَنِیَّۃُ وَلَا الدَّنِیَّۃُ (۱) میں افراط نہیں کرنا چاہتا۔ مرتے مرجاؤ لیکن ذلت قبول نہ کرو۔ انسان مرجائے لیکن ذلت قبول نہ کرے۔

صوفیہ کی تعلیمات کا نقصان

ہمارے اپنے عرفا اور صوفیہ کی تعلیمات بہت سے بلند نکات اور عالی تعلیمات کی حامل ہیں۔ لیکن عرفا اور صوفیہ کی تعلیمات کی وجہ سے اسلام کو پہنچنے والا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ ایک طرف تو عیسائی تعلیمات' دوسری طرف بدھ مت کی تعلیمات اور ایک اور سمت سے مانوی تعلیمات کے زیر اثر نفس کے خلاف مبارزہ' خود اُن کی اصطلاح میں نفس کشی اور خود فراموشی کے مسائل میں معاملہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر وہ اسلامی تعلیمات پر تھوڑی سی بھی توجہ دیتے' تو دیکھتے کہ اسلام ایک قسم کی خودی کو مارنے اور دوسری قسم کی خودی کو زندہ کرنے کا حامی ہے۔ اسلام

۱۔ موت ہو اور ذلت نہ ہو۔ (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۳۹۶)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہتا ہے کہ اپنے آپ کو فراموش کردو لیکن اپنے آپ کو بھلا نہ دو۔ اسلام تاکید کرتا ہے کہ اپنی حیوانی پستی کو بھلا دو لیکن روح میں ایک اور {چیز کے} تولد' ایک اور ولادت کا تقاضا کرتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ایک نئی خودی' ایک نئی منش انسان میں زندہ ہوجائے۔

شاید بارہ برس قبل یا اس سے زیادہ عرصہ گزرا ہوگا کہ میں اس نکتے کی جانب متوجہ ہوا تھا اور بعد میں جب میں نے آقائے سید غلام رضا سعیدی کے" اقبال نامہ" کا مطالعہ کیا' تو میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال بھی اس نکتے کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے "فلسفۂ خودی" کے عنوان سے ایک مفہوم بیان کیا ہے اور اُن کی مراد یہ ہے کہ اپنی خودی کو بازیاب کرو' اپنی انسانی خودی کو دوبارہ زندہ کرو۔

اسلام کی نظر میں یہ بات بھی ایک عذاب الٰہی ہے کہ خدا انسان کو ایسا بنادے کہ وہ خود اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھے: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ (۱) اُن لوگوں میں سے نہ ہوجانا جو خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ اور خدا کو فراموش کردینے کے نتیجے میں خدا اُن کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ ان کا عذاب یہ ہے کہ وہ خود کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔

کہتا ہے "خود" لیکن وہ خودی جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے' وہ آپ کے ذہن میں رہنا چاہئے کہ کیا ہے؟ وہ یہ نہیں کہتا کہ تمہیں اپنی شہوت یاد رہے۔ یہ نہیں کہتا کہ تمہیں اپنی جاہ طلبی یاد رہے۔ یہ نہیں کہتا کہ تمہیں اپنی دولت پرستی یاد رہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان چیزوں کو بھول جاؤ' تمہیں خود اپنا آپ یاد رہنا چاہئے۔ تم یہ نہیں ہو۔ تم اس سے بڑھ کر ہو۔ تم ایک ایسے انسان ہو' ایک ایسی شخصیت ہو' ایک ایسی منش ہو کہ جب تم اس منش کو اپنے اندر پالو گے تو اپنے آپ کو سراپا نور پاؤ گے' اپنے آپ کو سراپا عظمت و قدرت پاؤ گے' اپنے آپ کو سراپا عزت پاؤ گے' اسے فراموش نہ کرو۔ ورنہ آپ کو دنیا میں کون ملے گا جس نے حضرت علی سے زیادہ لوگوں کو تقویٰ کی دعوت دی ہو؟ (اس بات پر غور کرنا چاہئے' سوچ بچار کرنا چاہئے' اس کے بارے میں تفکر کرنا

۱۔ اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا۔ (سورۂ حشر ۵۹۔ آیت ۱۹)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

جاہئے) کون ہے جس نے حضرت علی سے زیادہ لوگوں کو نفسانی خواہشات سے مقابلے کی دعوت دی ہو؟ کون ہے جس نے حضرت علی سے زیادہ لوگوں کو ترک دنیا کی دعوت دی ہو؟ کوئی نہیں ہے! لیکن یہی علی اپنی تعلیمات میں انسانوں کو عزت اور سربلندی کی دعوت دیتے ہیں۔

وہ جملے جو ہم نے عرض کئے ہیں' جنھیں حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے فرمایا تھا' انہی میں آگے چل کر یہ جملہ بھی ہے: وَ لَاتَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ وَ قَدْ جَعَلَكَ اللّٰهُ حُرًّا۔ (۱) بیٹا! کسی دوسرے انسان کے غلام نہ بننا کہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ اپنی خودی کی حفاظت کرنا۔

علی علیہ السلام جو انکساری کی دعوت دیتے ہیں' علی جو دنیا کے منکسر ترین انسان ہیں' علی جو ہمیشہ نفسانی خواہشات سے مقابلے کی تاکید کرتے ہیں' وہ یہاں کس طرح انانیت کی دعوت دے رہے ہیں؟

نہیں' یہ انانیت اس انانیت سے ہٹ کر ہے۔ یہ وہ انانیت ہے جسے محفوظ رہنا چاہئے۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ: وَ لَاتَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ. ہرگز اپنے آپ کو کسی دوسرے کا غلام نہ بنانا۔ دوسرے کا غلام بننا' کسی اور کا بندہ ہونا' بندگان خدا میں سے کسی کے سامنے اظہار خاکساری کرنا' اس عظمت اور انسانی عزت کے منافی ہے جسے خدا نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

امام حسین کے کلمات

کیونکہ اس گفتگو کو ہم گزشتہ ہفتے امام حسین علیہ السلام کے روز ولادت کی مناسبت سے کی جانے والی گفتگو کے تسلسل میں عرض کر رہے ہیں' لہٰذا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس نکتے یعنی بزرگواری کے مسئلے کے بارے میں امام حسین (جن کے بارے میں گفتگو ہمیں اس مقام تک لائی ہے) کے کلمات سے آپ کی خدمت میں شاہد پیش کریں۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے برخلاف' امام حسین علیہ السلام کے زمانے کے مخصوص حالات کی وجہ سے ان کے زیادہ اقوال ہم

۱۔ بیٹا! کسی کا غلام نہ بننا کہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱)

http://fb.com/ranajabirabbas

تک نہیں پہنچے ہیں۔ ہمارے پاس بہت سے خطبوں اور گفتگوؤں کی صورت میں امیر المومنین کی متعدد روایات موجود ہیں' خصوصاً آپ کے پانچ سالہ دور خلافت کے خطبے اور تقریریں۔ لیکن امام حسن اور امام حسین اور خصوصاً امام حسین کے زمانے میں معاویہ کی طرف سے پیدا کئے ہوئے غیر معمولی گھٹن زدہ ماحول کی وجہ سے (جس کے متعلق آپ نے سنا ہے کہ کیسے عجیب حالات تھے' کوئی امام حسین سے ملنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور اگر آپ سے کوئی بات سنتا تو اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا) آپ کے بہت کم کلمات نقل ہوئے ہیں۔ ایک زمانے میں' جب ہم ان کتب کا مطالعہ کر رہے تھے جن میں امام حسین کے کلمات نقل ہوئے ہیں' تو وہاں یہ عجیب بات دیکھی کہ باوجود یہ کہ امام حسین کے کلمات اتنے زیادہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی آپ کے کلمات میں بزرگواری سے زیادہ کوئی اور نکتہ نظر نہیں آتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام حسین کی روح بزرگواری کے مساوی ہے۔ آپ ہمیشہ بزرگواری کی بات کرتے ہیں۔ اب ہم ان کے فرامین میں سے کچھ بیان کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک جملہ تو وہی ہے جو آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا تھا' جسے آپ لوگوں نے بہت زیادہ سنا ہوا بھی ہے۔ جب آپ جنگ کر چکے' حملے کر چکے' دو بدو لڑائی لڑ چکے' غیر معمولی طور پر تھک چکے اور تیروں کے زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر چکے' جب آپ کا بہت زیادہ خون بہہ چکا اور اب کھڑے رہنے کی طاقت بھی نہ رہی' اب زیادہ سے زیادہ آپ تلوار کے سہارے سے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو سکتے ہیں اور اب آپ کے بدن میں رمق بھی نہیں رہی ہے' اس موقع پر آپ دیکھتے ہیں کہ گویا کچھ لوگ حرم کے خیام کی طرف جانا اور انہیں لوٹنا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ کسی نہ کسی طرح اٹھتے اور بلند آواز سے فرماتے ہیں کہ: وَيْلَكُمْ يَا شِيْعَةَ آلِ اَبِيْ سُفْيَانَ! اے خود فروختہ لوگو! اے آل ابی سفیان کے پیروکارو! اے وہ لوگو جنہوں نے ان کی نوکری میں اپنے آپ کو پست کر لیا ہے! وائے ہو تم پر اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ دِيْنٌ وَ كُنْتُمْ لَاتَخَافُوْنَ الْمَعَادَ فَكُوْنُوْا اَحْرَارًا فِيْ دُنْيَاكُمْ. اگر تم مسلمان نہیں ہو تو انسان تو رہو تمہارے اندر ذرہ برابر حریت تو ہونی چاہئے' آزاد مرد بنو۔ اگر تم خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

تو کم از کم شرافت تو تمہارے اندر ہونی چاہئے۔ ایک شریف انسان' ایک ایسا انسان جس میں انسانیت کی معمولی سی رمق بھی ہو' وہ ایسا کام نہیں کرے گا جو تم کر رہے ہو۔ (وہ) کہنے لگے: اے فرزند فاطمہ! تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے حریت کے خلاف کونسا کام کیا ہے؟ فرمایا: انا اقاتلکم وانتم تقاتلونی والنساء لیس علیهنّ جناح. (۱)

امام حسین علیہ السلام نے (کربلا کے) راستے میں جو خطاب کئے' ان میں کرامت اور بزرگواری موجزن نظر آتی ہے۔ مکہ میں ارشاد فرمائے ہوئے آپ کے پہلے خطبے سے' وہاں کے جانے والے آپ کے آخری خطاب تک میں۔ آپ نے مکہ میں جو خطبہ دیا تھا وہ اس طرح شروع ہوتا ہے: خطّ الموت علی وُلد آدم مخطّ القلادة علی جید الفتاة. یہاں تک کہ آخر میں فرماتے ہیں: فمن کان فینا باذلاً مهجته و موطناً علی لقاء الله نفسه فلیرحل معنا فانّنی راحلٌ مصبحاً ان شاء الله. (۲) آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میری روح کسی صورت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ان فاسد حالات کو دیکھوں اور زندہ رہوں چہ جائیکہ میں خود اس کا حصہ بن جاؤں۔ انّی لا اری الموت الا سعادة و الحیوة مع الظالمین الا برما. (۳) ایسے لوگوں میں شامل نہ ہونا میں اپنے لئے افتخار سمجھتا ہوں۔ ان ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا میرے لئے ناگوار ہے' روحانی افسردگی ہے۔

راستے میں امام کو بہت سے لوگ ملے۔ وہ آپ سے گفتگو کیا کرتے تھے اور زیادہ تر وہی پدرانہ نصیحتیں کیا کرتے تھے جو ہر پست حوصلہ شخص کرتا ہے کہ: جناب عالی! حالات بہت خطرناک ہیں۔ جائیے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالئے۔ (امام نے) ان میں سے ایک کے جواب میں فرمایا: میں تم سے وہی بات کہوں گا جو پیغمبر کی معیت میں جنگ کے لئے جانے والے ایک انصاری نے اپنے اُس چچازاد بھائی کے جواب میں کہی تھی جو اسے اس جنگ میں شرکت سے روکنا چاہتا تھا۔ اسکے بعد امام نے یہ اشعار پڑھے کہ:

۱۔ [illegible] ص ۵۳ ۳۔ لہوف۔ ص ۶۹

http://fb.com/ranajabirabbas

سامضی وما بالموت عار علی الفتی
اذا ما نوی حقاً و جاهد مسلما
وواسی الرجال الصالحین بنفسه
وفارق مثبوراً و خالف مجرما
فان عشت لم اندم وان مت لم الم
کفی بک ذلّاً ان تعیش و ترغما (۱)

یعنی نہیں میں جاؤں گا! موت ایک مرد حُر کے لئے اس صورت میں نہ صرف ذلت نہیں بلکہ افتخار ہے جبکہ وہ جس راہ پر گامزن ہے اور جس پر مارا جاتا ہے اس پر اسکی نیت حق (کی ہمراہی) ہو اور وہ ایک مسلمان کی طرح جہاد کر رہا ہو۔ ایسی موت جو صالحین کی مدد اور ان کی معیت اور مجرموں کی مخالفت میں آئے افتخار ہے۔ میں یا تو زندہ رہوں گا یا مر جاؤں گا۔ یا قتل کر دیا جاؤں گا یا سلامت رہوں گا۔ جس راہ پر میں گامزن ہوں اگر اس پر زندہ رہا' تو میری زندگی باافتخار ہے اور اس میں کوئی ذلت نہیں اور اگر مر جاؤں تب بھی ملامت کا نشانہ نہیں ہوں گا: کفی بک ذلّاً ان تعیش و ترغما. مجھے منع کرنے والے! تیرے لئے یہی ذلت کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور تیری ناک رگڑی جائے۔ میں زندہ رہوں اور مجھے ذلیل کر دیا جائے؟! ہرگز نہیں! میں ایسی زندگی چاہتا ہوں جو سربلندی کے ساتھ ہو' ذلت کے ساتھ زندگی کا میرے نزدیک کوئی مفہوم نہیں۔ میں ضرور جاؤں گا۔

پھر جب آپ راستے میں اپنے اصحاب کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں' تو کرامت و بزرگواری اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینا آپ کا شعار ہوتا ہے: الا ترون ان الحق لا یعمل به و ان الباطل لا یتناهی عنه؟ کیا تم نہیں دیکھتے؟ (کیا) تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی نہیں ہیں؟ (کیا) نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا' (کیا) نہیں دیکھتے کہ اس قدر فساد برپا ہے

۱۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۲۳۰ نفس المہموم۔ ص ۱۱۶

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

اور کوئی اس سے روکنے والا نہیں؟ ایسے حالات میں: لِيَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَآءِ اللّٰهِ مُحقاً (۱) مومن کو چاہئے کہ موت طلب کرے۔

حسین ابن علی علیہما السلام نے کرامت اور شرافت کو اپنے بابا سے میراث میں پایا تھا۔ جب حضرت علی علیہ السلام کو اطلاع دی گئی کہ معاویہ کے لشکریوں نے انبار شہر میں لوٹ مار مچائی ہے اور اس دوران ایک غیر مسلم (اہل ذمہ) عورت جو مسلمانوں کی پناہ میں تھی' کی بالیاں بھی لوٹی ہیں' تو آپ نے ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم! اگر اس قسم کے حادثے کے غم میں ایک مسلمان کو موت آجائے تو میرے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہے۔

آیئے روز عاشورا' دیکھتے ہیں کہ امام حسین کی زندگی کے آخری لمحات تک کرامت و بزرگواری یعنی وہی اسلامی اخلاق کا محور' اسلامی تربیت کا محور' آپ کے کلمات میں نظر آتا ہے۔

ابن زیاد کے قاصد کے جواب میں فرماتے ہیں: لَا اُعْطِيْكُمْ بِيَدِيْ اِعْطَاءَ الذَّلِيْلِ وَلَا اُقِرُّ اِقْرَارَ الْعَبِيْدِ. میں ایک ذلیل انسان کی طرح تمہارے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دوں گا (بیعت نہیں کروں گا) نہ کسی غلام کی طرح آ کر اقرار کروں گا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ یہ بات محال ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ اسی حالت میں جنگ کرتے ہیں۔ یعنی اس حالت میں جبکہ آپ کے تمام اصحاب قتل ہو چکے ہیں تمام اقربا شہید ہو چکے ہیں' اپنی آنکھوں سے اپنے جوان بیٹوں کو قتل ہوتے دیکھ چکے ہیں' اپنے بھائیوں کے ٹکڑے اڑتے دیکھ چکے ہیں' اور چشم دل سے یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کچھ ہی دیر بعد ان کے حرم کے خیموں پر حملہ کیا جائے گا اور اہل بیت اسیر کر لئے جائیں گے۔ اس کے باوجود اسی حالت میں جنگ کر رہے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں' سیادت اور آقائی کی حکومت کے نعرے۔ لیکن اس معنی میں آقائی نہیں کہ میں حاکم بنوں اور تم محکوم (بلکہ اس معنی میں کہ) میں ایسا آقا ہوں جس کی آقائی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ایک پست صفت قبول کر لے۔

۱۔ تحف العقول۔ ص ۲۴۵

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اَلْمَوْتُ اَوْلٰى مِنْ رُكُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰى مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ (۱)

یہ ہیں روح کی بزرگواری کے معنی' اور یہ ہے فرق بزرگوں اور بزرگواروں کے درمیان۔ البتہ بزرگوار حضرات بزرگ بھی ہوتے ہیں' لیکن تمام بزرگ بزرگوار نہیں ہوتے۔ تمام بزرگوار بزرگ ہیں۔ اسی لئے جب ہم ان بزرگواروں کا سامنا کرتے ہیں' تو ہمیشہ ان کی بزرگواری کا ذکر کرتے ہیں' نہ کہ بغیر بزرگواری کے صرف ان کی بزرگی کا: اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتَ الزَّكٰوةَ وَ اَمَرْتَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (۲)

ہم اگر نادر شاہ کے سامنے کھڑے ہوں' تو کیا کہیں گے؟ اس کی بزرگی کی بات کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم ہندوستان گئے' وہاں لوٹ مار مچائی اور ہمارے لئے کوہ نور ہیرا لائے' نور کا دریا ہمارے لئے لائے' کوہ نور ہمارے لئے لائے۔ لیکن امام حسین سے کہیں گے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے زکات دی' دولت جمع کر کے نہیں لائے۔ آپ نے امر بالمعروف کیا' نہی عن المنکر کیا۔ آپ نے نماز کو زندہ کیا' جو بندے کے خدا کے ساتھ تعلق کی بنیاد ہے۔ آپ نے راہ خدا میں کوشش کی' نہ شکم کی خاطر' نہ ہی اپنی جاہ طلبی کی راہ میں۔ آپ ایک بڑے جاہ طلب نہیں تھے۔ آپ ایک بڑے انتقام طلب نہ تھے۔ آپ ایک بڑے کینہ پرور نہ تھے۔ آپ ایک بڑے دولت طلب نہ تھے۔ آپ ایک بڑے مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ آپ وہ تھے جنہوں نے اپنی ذاتی اور حیوانی خودی کو فراموش کر دیا تھا اور اس خودی کو زندہ کر دیا تھا جو آپ کو خدا سے ملاتی تھی۔ اَشْهَدُ اَنَّكَ جَاهَدْتَ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ. (۳) ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے جدوجہد کی' جہاد کیا لیکن اپنی خواہشات کے لئے نہیں اور نہ ہی کرسی اور عہدے کے لئے بلکہ حق و حقیقت کی راہ میں۔

۱۔ النفس المہموم۔ ص ۲۱۹
۲۔ مفاتیح الجنان۔ زیارت مطلقہ امام حسین علیہ السلام
۳۔ مفاتیح الجنان۔ زیارت مطلقہ امام حسین علیہ السلام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

خدایا! تجھے حقیقت حسین ابن علی کی قسم دیتے ہیں کہ وہ روح جو اخلاق اور تربیت اسلامی کا محور ہے یعنی کرامت و بزرگواری وہ ہم تمام مسلمانوں کو نصیب فرما۔

اس حسینی عظمت و شرافت اور بزرگواری کے احساس کی روشنی سے ہمارے دلوں کو منور فرما۔

خدایا! ہم مسلمانوں کو اپنی تقدیر کے بارے میں دانا، بینا اور مشتاق فرما۔

وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ۔

☆......☆......☆

غیب پر ایمان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

الحمدللّٰه ربّ العالمين بارئ الخلائق اجمعين و الصلاة و السّلام على عبد اللّٰه و رسوله و حبيبه و صفيه سيّدنا و نبيّنا و مولانا ابى القاسم محمد صلى اللّٰه عليه و آله و سلم و على آله الطّيّبين الطاهرين المعصومين.

اعوذ باللّٰه من الشّيطان الرّجيم.

"اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"(۱)

ہمارے یہاں معمول ہے کہ ہم بعض افراد کو مومن کہتے ہیں۔ (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص ایک مرد مومن ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ عابد اور عبادت گزار انسان ہے۔ یعنی اپنے فرائض ادا کرتا ہے، مستحبات بھی بہت انجام دیتا ہے، زیارت پر جاتا ہے، نوافل پڑھتا ہے، بہت

۱۔ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق انہیں دیا گیا ہے اس سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

زیادہ ذکر الٰہی کرتا ہے۔

لیکن ایک دوسرا شخص جس میں یہ باتیں نہیں پائی جاتیں' اسکے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ آدمی ایک مومن یا مقدس شخص نہیں ہے۔ یہ عام رائج اصطلاح ہے۔ لیکن قرآن کے پاس بھی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن بعض افراد کو مومن اور بعض دوسرے افراد کو کافر اور غیر مومن کہتا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں مومن کے کیا معنی ہیں؟

مومن یعنی صاحب ایمان۔ غیر مومن یعنی وہ شخص جس کے پاس ایمان نہ ہو۔

ایمان کے کیا معنی ہیں؟

(آیئے) ایمان ہی سے شروع کرتے ہیں:

ایمان کا تعلق دل' قلب اور اعتقاد سے ہے' اور یہ قرآن مجید کی نص ہے۔ (ایک مرتبہ) کچھ عرب دیہاتی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اٰمَنَّا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (اے اللہ کے رسول) ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قرآن کی آیت نازل ہوئی: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۱)

یعنی چند بادیہ نشین اعراب آپ (پیغمبر) کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ آپ ان سے کہیے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں (اسلام لانے کے معنی ہیں زبان سے کلمہ پڑھ لینا' لیکن ایمان کا تعلق دل اور قلب سے ہے' باطنی اعتقاد سے ہے) ابھی تم لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا ہے۔

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ ایمان' انسان کی روح سے تعلق رکھنے والی ایک واقعیت اور حقیقت ہے' اس کا تعلق انسان کے بدن سے نہیں ہے' نہ اس کا تعلق انسان کی پیشانی سے ہے کہ

۱۔ یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۴)

http://fb.com/ranajabirabbas

(اُس پر) سجدے کا نشان ہو یا نہ ہو' نہ ہی اس کا تعلق انسان کی زبان سے ہے کہ (اس پر) ذکر خدا جاری ہو یا نہ ہو۔ بلکہ (ایمان) ان امور کی بنیاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ ایک قلبی' فکری اور اعتقادی حالت ہے۔

آپ پوچھیں گے کس چیز پر ایمان؟ ہم کہیں گے خدا پر ایمان' کہیں گے خدا کی صفات پر ایمان' کہیں گے پیغمبر کی رسالت اور ان پر نزول وحی پر ایمان' کہیں گے اس بات پر ایمان کہ ایک روز قیامت برپا ہوگی۔ جی ہاں' یہ سب باتیں درست ہیں' لیکن خود قرآن نے ان سب کو ایک لفظ میں جمع کر دیا ہے' ہم صرف اُس (ایک لفظ) کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لفظ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں ایک اعتبار سے اور تیسری آیت میں ایک دوسرے اعتبار سے ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس طرح پڑھتے ہیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" (۱)

"اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" وہ لوگ جو پوشیدہ حقائق پر ایمان رکھتے ہیں' کی عبارت میں "غیب" کا ایک لفظ چند الفاظ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ {یہاں اس سے مراد} خدا پر ایمان ہے' صفات پروردگار پر ایمان ہے' خاص حالات میں پوشیدہ اور غیبی ہاتھ کی کارفرمائی پر ایمان ہے۔

اب ہم اس اجتماع کی مناسبت سے لفظ "غیب" کی وضاحت کریں گے' اور اس کے بعد اپنی اگلی عرائض جاری رکھیں گے۔

غیب کے معنی

غیب سے کیا مراد ہے' جس پر ایمان کو مومن اور غیر مومن کا فرق قرار دیا گیا ہے؟

ہم نے عرض کیا کہ غیب' یعنی پوشیدہ' مخفی' چھپا ہوا۔ پھر بھی بات واضح نہیں ہوئی۔ پوشیدہ

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱-۳

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

سے کیا مراد ہے؟ اس وقت جبکہ ہم اس احاطے میں بیٹھے ہوئے ہیں' اس دیوار کی دوسری طرف ہم سے پوشیدہ ہے۔ پس اگر ہم اس دیوار کے دوسری طرف ہونے والی باتوں پر ایمان رکھیں' تو کیا یہ غیب پر ایمان ہے؟ اگر ابھی ہم سے پوچھا جائے کہ مثلاً یہ زمین جس پر ہم بیٹھے ہوئے ہیں اس زمین کے پانچ سو میٹر نیچے کیا ہے؟ (ہم کہیں کہ ہم سے) پوشیدہ ہے' ہمیں نہیں معلوم' لیکن اگر ہم جانتے ہوں' تو کیا یہ غیب پر ایمان ہوگا؟ نہیں۔ آنے والی کل ہم سے نہاں ہے' اب اگر ہم ان واقعات پر ایمان رکھیں جو کل پیش آنے والے ہیں' اگر کل پیش آنے والے حوادث کے متعلق پیش گوئی کریں اور اس پیش گوئی پر ایمان رکھیں' تو کیا یہ غیب پر ایمان رکھنا ہوگا؟ نہیں۔

ہم سے تو ماضی بھی پوشیدہ ہے۔ کیا ماضی پر ایمان غیب {پر ایمان رکھنا} ہے؟ نہیں۔ تو پھر غیب پر ایمان رکھنے سے کیا مراد ہے؟ پوشیدہ چیزوں پر ایمان کے کیا معنی ہیں؟ پوشیدہ سے کیا مراد ہے؟

اس طرف توجہ فرمایئے:

اس دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے حواس سے(۱) قابلِ ادراک ہیں (بعض لوگوں کے بقول ہمارے پاس اس سے زیادہ حواس پائے جاتے ہیں لیکن اسی قسم کے ہیں) اس وقت اس دیوار کی دوسری جانب ہم سے پوشیدہ ہے' لیکن ہمارے پاس یہ امکان موجود ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیوار کے اُس طرف ہونے والی سرگرمیوں کو دیکھ سکیں' یعنی وہ سرگرمیاں ہماری آنکھوں سے مخفی نہیں رہ سکتیں' ہماری آنکھیں انہیں دیکھنے پر قادر ہیں' ہمارے کان انہیں سننے پر قادر ہیں۔ یا وہ چیزیں جنہیں ہماری ذائقے کی حس چکھنے پر قادر ہے' یا چھونے کی حس انہیں چھونے پر قادر ہے' انہیں ''شہادت'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ چیزیں جنہیں انسان اپنے ظاہری بدن سے درک کرسکتا ہے۔

ہمارے پاس کچھ کھلے اور آشکار ادراکات ہیں (جن کے ذرائع) ہمارے ظاہری بدن

۱۔ یعنی دیکھنے' سننے' چکھنے' چھونے اور سونگھنے کی حس۔

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں رکھے گئے ہیں' اور اس حد تک یہ حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنی جو حواس ہمارے پاس ہیں' وہ حیوانات میں بھی ہیں اور کچھ مقامات پر ان میں سے بعض حواس میں حیوانات ہم سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ہیں۔ بہت سے حیوانات کی آنکھیں انسان کی آنکھوں سے زیادہ تیز ہیں۔ بہت سے حیوانوں کے کان' مثلاً کتے کے کان انسان کے کانوں سے زیادہ حساس ہیں۔ بہت سے حیوانوں کی سونگھنے کی حس' جن میں چیونٹی بھی شامل ہے' یہی کمزوری چیونٹی' (اس کی سونگھنے کی حس) غیر معمولی طور پر حساس ہے۔ آپ اگر ایک برتن میں گوشت رکھ کر اسے کمرے میں موجود طاق پر رکھ دیں۔ اگر آپ کی آنکھ اسے نہ دیکھے' تو کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ اپنی سونگھنے کی قوت کے ذریعے یہ نہیں جان سکتے کہ یہاں اس کمرے میں اس وقت کچھ گوشت موجود ہے۔ لیکن چیونٹی اپنی سونگھنے کی حس کے ذریعے بہت اچھی طرح اسے جان لیتی ہے اور درک کرلیتی ہے۔ انہیں کہتے ہیں حواس۔

وہ چیزیں جنہیں انسان اپنے حواس کے ذریعے درک کرسکتا ہے' کہا جاتا ہے کہ وہ غیب میں شامل نہیں ہیں' آشکارا ہیں۔ {بعض} حوادث کو ہم اپنے انہی حواس کے ذریعے درک کرلیتے ہیں' یعنی جو صورت کل پیدا ہوگی اسے میں کل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں' وہ آواز جو کل بلند ہوگی میں اسے اپنے کانوں سے سن سکتا ہوں۔ وہ کھانا جو کل پکے گا میں اسے اپنی زبان سے چکھ سکتا ہوں۔ پس یہ غیب نہیں ہے' قرآنی اصطلاح میں یہ شہادت ہے۔ تو پھر غیب کیا ہے؟

غیب یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا اقرار اور اعتراف ہو کہ کائنات میں کچھ ایسے حقائق اور سچائیاں ہیں جنہیں میں اپنے بدن کے اس ظاہر' یعنی اپنے حواس کے ذریعے درک نہیں کرسکتا' چاہے وہ {حقائق اور سچائیاں} میرے سامنے موجود بھی ہوں۔ میری آنکھ' میرے کان' میری زبان' میری چھونے اور سونگھنے کی حس' ان کے ادراک کی قدرت نہیں رکھتے۔ یعنی میں خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ دوں کہ میرے پاس موجود یہ حواس' جو مجھے اپنے سے باہر کی دنیا سے تعلق کے لئے دیئے گئے ہیں انتہائی انتہائی محدود ذرائع ہیں۔ بتایئے مجھے یہ آنکھیں کیوں دی گئی ہیں؟ اس لئے کہ جب میں اس دنیا کے ساتھ رنگوں اور شکلوں کے ذریعے تعلق پیدا کرنا چاہوں تو ان سے کام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

لے سکوں' اپنا راستہ ڈھونڈ سکوں' بس اسی مقصد کے لئے۔ مجھے کان کیوں دیئے گئے ہیں؟ اس لئے کہ صوتی امواج کے نام سے کچھ موجیں ہیں جن کا ادراک کانوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب میں چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اپنے روزمرہ کام انجام دوں' تو میرے پاس کان ہونے چاہئیں۔ یہی معاملہ دوسرے حواس کا ہے۔

لیکن کیا میرے پاس موجود یہ حواس' میرے لئے وہ ذرائع ہیں جن کے توسط سے میں کائنات میں موجود ہر شئے کو درک کرسکتا ہوں؟ یہاں تک کہ اگر میں کسی چیز کو اپنے حواس سے درک نہ کروں تو اسے {اسکے وجود کو} قبول نہ کروں؟ نہیں' یہ غلط فہمی ہے۔ بلکہ وہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جس کا انسان اپنی زندگی میں مرتکب ہوتا ہے' اور اسے علمی شکل وصورت بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو حواس اسے اس دنیا اور اس طبیعت میں دیئے گئے ہیں' یہ اس لئے ہیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ اسے انہی حواس کے ذریعے دریافت کرے' یہاں تک کہ اگر کوئی چیز ان حواس کے ذریعے درک نہ کرسکے' تو اس کا انکار کرے اور کہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ اگر وہ چیز ہوتی تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکتا' اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا' یا اپنے کانوں سے اسے سن سکتا' یا اپنی زبان سے اسے چکھ سکتا۔

وہ تمام چیزیں جن پر انسان کو ایمان رکھنا چاہئے' انہیں قرآن مجید نے لفظ غیب کے ذریعے بیان کیا ہے۔ {غیب پر ایمان یعنی} اس بات پر ایمان کہ کچھ حقائق اور سچائیاں ایسی ہیں جو میرے حواس کے دائرے سے باہر ہیں۔ پس میں کس چیز کے ذریعے ان کے وجود کو قبول کروں؟ اس سلسلے میں انسان کو ایک اور راستہ دکھایا گیا ہے' کچھ دلائل انسان کو فراہم کئے گئے ہیں جن کے ذریعے وہ غیب کو قبول کرسکتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی واضح ہے کہ قرآن مجید میں یہ جو کہا گیا ہے کہ مومنین وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو چیز ایک پوشیدہ امر کے طور پر ہمیں بتائی جائے {اسکے متعلق} ہم کہیں کہ کیونکہ ہم مومن ہیں پس اسے قبول کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں عامل آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس جنوں کا ایک لشکر ہے' جس میں فلاں فلاں خصوصیات ہیں اور جو فلاں فلاں کام کرسکتا ہے اور {انکی یہ باتیں سن کر} ہم کہیں کہ: اَلَّذِینَ

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یُؤمِنُونَ بالغَیبِ کیونکہ ہم سے غیب پر ایمان رکھنے کو کہا گیا ہے' لہٰذا ہمیں اس عامل کے دعوے پر بھی ایمان رکھنا چاہئے۔

وہ غیب کیا ہے {جس پر ایمان رکھنا چاہئے} قرآن مجید کے دوسرے مقامات اور قرآن کے علاوہ بھی دوسرے مصادر میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ غیب کی صورت میں جو بھی دعویٰ کیا جائے اس پر ایمان لایا جائے' بلکہ ہمیں غیب کا منکر نہیں ہونا چاہئے' پوشیدہ حقائق کو مسترد کرنے والا نہیں ہونا چاہئے۔

غیب پر ایمان لانے کا راستہ

اب اگر آپ یہ کہیں کہ انسان کس راستے سے غیب پر ایمان لاسکتا ہے' تو ہم عرض کریں گے کہ اس کے چند مرحلے ہیں۔ اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسی ہزاروں نشانیاں ہیں جو کم از کم غیب سے انکار کا راستہ تو روک ہی دیتی ہیں۔ یعنی انسان کو غیب کے انکار کے مرحلے سے اس پر شک کے مرحلے میں داخل کردیتی ہیں۔ آج معلوم ہو چکا ہے کہ ہماری اسی محسوس اور ملموس دنیا میں ہزاروں ایسی چیزیں موجود ہیں جنہیں ہم محسوس نہیں کرتے' لمس نہیں کرتے' اپنے ان حواس سے انہیں درک نہیں کرتے۔ آپ کی خدمت میں ایک بہت واضح مثال عرض کرتے ہیں:

قدیم زمانے میں فضا میں موجود لہروں میں سے لوگ جس صرف ایک لہر کو پہچانتے تھے' وہ آواز کی لہر تھی۔ آواز کے باب میں زمانہ قدیم سے علما کے درمیان بحث رہی ہے۔ ایک انسان بولتا ہے اور دوسرا سنتا ہے' ایک پتھر سے دوسرا پتھر ٹکراتا ہے اور اسکی آواز انسان کے کانوں تک پہنچتی ہے' آخر یہ کیسے ہوتا ہے؟ کہتے تھے کہ یہ ہوا جسے آپ یہاں محسوس کرتے ہیں' اور کبھی اس کے وجود کو حرکت کرتے ہوئے یا کسی اور وقت درک کرتے ہیں' یہ پانی کی طرح ہے۔ جس طرح آپ پانی کو اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ اس میں لہر پیدا ہوتی ہے' اور جب آپ ایک پتھر پانی کے حوض میں پھینکتے ہیں تو وہ لہر پیدا کرتا ہے' جو پھیلتی جاتی ہے اور وہ جتنا زیادہ پھیلتی ہے اتنی ہی کمزور ہوتی چلی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

جاتی ہے اسی طرح جب آپ گفتگو کرتے ہیں یا دو پتھر ٹکراتے ہیں تو ہوا میں ایک لہر پیدا ہوتی ہے اور یہ لہر آپ کے کان میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں ایک سسٹم موجود ہے ایک پردہ ہے ہڈی ہے اعصاب ہیں جو حرکت میں آتے ہیں نتیجتاً آپ آواز نام کی ایک چیز کو درک کرتے ہیں۔ اب انسان آواز کی ان لہروں کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات نہیں رکھ سکتا تھا۔

آج انہی حسی علوم کے ذریعے یعنی ان قرائن کے ذریعے جنہیں انہی حسی علوم نے انسان کو فراہم کیا ہے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آواز کی لہروں کے علاوہ دوسری ایسی لہریں بھی ہیں جنہیں بنیادی طور پر آواز کی لہروں کے ساتھ نسبت نہیں دی جا سکتی اور حتیٰ نہ ہمارے کان اور نہ ہمارے حواس میں سے کوئی اور حس ان لہروں کے ادراک کی قدرت رکھتی ہے لیکن یہ لہریں موجود ہیں۔ جیسے بجلی کی لہریں وہ لہریں جو ریڈیو نشر کرتے ہیں اور ان لہروں کو وصول کرنے والا آپ کا ریڈیو انہیں آواز کی لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جو لہریں ریڈیو اسٹیشن نشر کرتا ہے وہ آواز کی لہریں نہیں ہوتیں۔ اگر یہ آواز کی لہریں ہوں تو مثلاً جس وقت یہ تہران میں نشر ہوں تو انہیں خراسان تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ یا شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگے۔ کہتے ہیں کہ اگر آواز کی لہریں قم اور تہران کا درمیانی فاصلہ یعنی ۲۴ فرسخ (تقریباً ۷۲ میل) طے کرنا چاہیں تو انہیں تقریباً ۴۰ منٹ لگیں گے۔ ان کی رفتار برقی لہروں کے مقابلے میں انتہائی سست ہے۔ مثلاً میں جو یہاں تقریر کر رہا ہوں اگر یہاں دو سو میٹر کے فاصلے پر ایک لاؤڈ اسپیکر بھی لگا ہوا ہو اور اس سے بھی آواز آ رہی ہو اور آپ میری آواز بھی سن رہے ہوں اور لاؤڈ اسپیکر کی آواز بھی تو اس صورت میں آپ کو الفاظ ذرا وقفے سے سنائی دیں گے یعنی آپ پہلے ایک لفظ براہِ راست مجھ سے سنیں گے اور پھر وہی لفظ ایک لمحے کے وقفے سے لاؤڈ اسپیکر سے سنیں گے۔ یعنی لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز کی لہریں آپ تک پہنچنے میں کچھ وقت لیتی ہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ جب ریڈیو میں بولا جا رہا ہوتا ہے تو آپ اسی لمحے سن رہے ہوتے ہیں۔ یا جب ٹیلی فون پر مثلاً خراسان بات کر رہے ہوتے ہیں تو گویا ایسے ہوتا ہے جیسے وہیں باتیں کر رہے ہیں۔ آواز برقی لہروں کی صورت میں (خواہ تاروں کے ذریعے [illegible] کے) اتنی تیز رفتار سے خراسان جاتی ہے اور پھر اسی تیز رفتار

سے یہاں واپس آ جاتی ہے۔

مشہور کہاوت ہے کہتے ہیں کہ برطانیہ کے مشہور گھڑیال کی آواز کو خود اس چوک (جس پر یہ گھڑیال نصب ہے) پر کھڑے لوگوں کی نسبت دنیا کے دوسرے سرے پر رہنے والے لوگ جلد سن لیتے ہیں۔ یعنی اگر آپ یہاں برطانوی ریڈیو لگائیں تو اس گھڑیال کی آواز ان لوگوں سے پہلے سن لیں گے جو اس وقت برطانیہ میں اسی چوک پر موجود ہوں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو لوگ ہوا اور آواز کی لہروں کے ذریعے اس گھڑیال کی آواز سننا چاہتے ہیں ممکن ہے ان تک اس کی آواز پہنچنے میں ایک یا دو سیکنڈ لگیں لیکن جو لوگ اس کی آواز کو مثلاً ایران میں برقی لہروں کے ذریعے سن رہے ہیں ان تک یہ آواز پہنچنے میں ایک سیکنڈ تو دور کی بات ہے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے یا شاید دس لاکھویں حصے کی دیر بھی نہ لگے۔ نتیجے کے طور پر آپ اس آواز کو وہاں موجود ایک برطانوی سے پہلے سن لیں گے۔

یہ لہریں فضا میں موجود ہیں۔

ہم کس حس کے ذریعے انہیں درک کر سکتے ہیں؟

کسی حس کے ذریعے نہیں صرف علمی قرائن کے ذریعے۔ یہاں تک کہ سائنسدان ان لہروں کو دیکھے بغیر ان کا طول بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ پس سرسری طور پر ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ لہریں موجود ہیں۔

انتہائی جاہلانہ بات ہوگی اگر انسان اپنے ایمان اور تصدیق کے دائرے کو محدود کرے اور کہے کہ میں صرف ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں جنہیں میں براہِ راست اپنی کسی حس سے درک کرتا ہوں۔

غیب پر ایمان کے معنی

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنی کیا ہیں؟ کیا فقط اتنا ایمان رکھنا کافی ہے کہ ایک غیب ہے ایک خدا ہے وحی ہے ملائکہ اور فرشتے ہیں آسمانی کتب کا ایک غیبی سرچشمہ ہے قیامت کا بھی

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

ایک دن ہے؟ اسی طرح یہ ایمان رکھتے ہوں کہ ایک امام زمانہ موجود ہیں؟

کیا یہی غیب پر ایمان ہے اور یہیں اس کا اختتام ہو جاتا ہے؟

نہیں' اس سے بڑھ کر ہے۔ غیب پر ایمان اس وقت غیب پر ایمان ہے جب انسان اپنے اور غیب کے درمیان ایک رابطے پر بھی ایمان رکھتا ہو۔ ہم یہ ایمان رکھیں کہ ایسا نہیں ہے کہ غیب ایک الگ چیز ہے اور ہم ایک جداگانہ چیز۔ ہمیں غیبی امداد پر بھی ایمان رکھنا چاہئے۔ آپ سورۂ حمد میں پڑھتے ہیں: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. اے پوشیدہ اور غائب خدا! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تجھ ہی سے امداد طلب کرتے ہیں' تجھ ہی سے طاقت طلب کرتے ہیں (یہ مدد طلب کرنا ہے) جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ طاقت جو تو نے ہمیں عطا کی ہے ہم اسی کو استعمال کر رہے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہر طاقت کا سرا تیرے ہاتھ میں ہے' ہم تجھ سے قوت چاہتے ہیں' تجھ سے مدد کے طلبگار ہیں' تجھ سے ہدایت کے طالب ہیں۔

شب جمعہ ہے' ہم دعائے کمیل میں پڑھتے ہیں: يَارَبِّ يَارَبِّ يَارَبِّ، قَوِّ عَلٰى خِدْمَتِكَ جَوَارِحِيْ وَ اشْدُدْ عَلَى الْعَزِيْمَةِ جَوَانِحِيْ وَ هَبْ لِيَ الْجِدَّ فِيْ خَشْيَتِكَ وَ الدَّوَامَ فِي الْاِتِّصَالِ بِخِدْمَتِكَ. اے پروردگار! اے پروردگار! اے پروردگار! میرے اعضاو جوارح کو قوت عطا فرما لیکن اپنی خدمت کی خاطر (اپنے آپ کو خدمت کے لئے آمادہ غلام ظاہر کرتے ہیں' خدا سے مدد طلب کرتے ہیں اور اس سے طاقت چاہتے ہیں) نہ صرف اپنے اعضاو جوارح کے لئے قوت چاہتے ہیں' بلکہ اپنے دل' اپنے عزم و ارادے کے لئے بھی تجھ سے قوت طلب کرتے ہیں۔ خدایا! میرے دل کو عزم و ارادہ عطا فرما' میرے ارادے کو مضبوط فرما۔

بنیادی طور پر دعا سے مراد کیا ہے؟ ٹھیک ہے' میں اپنے لئے غیب پر ایمان رکھتا ہوں' خود اپنے لئے؟ نہیں' ایک نکتہ بیان کیا جاتا ہے جو اچھی بات ہے۔ کہتے ہیں کہ دین و مذہب اور فلسفۂ الٰہی کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ فلسفۂ الٰہی (البتہ وہ الٰہی فلسفے جنہوں نے مذہب اسلام سے مدد نہ لی ہو وہ) زیادہ سے زیادہ ایک ایسے خدا پر اعتقاد رکھتے

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں جو دنیا سے جدا ہے اور ایک ایسے غیب کے معتقد ہوتے ہیں جو شہود سے جدا ہے۔ ایک ستارہ شناس انسان کی طرح جو کہتا ہے کہ منظومۂ شمسی میں نیپچون نام کا ایک ستارہ دریافت ہوا ہے' کہکشاں میں فلاں چیز دریافت ہوئی ہے۔ بہت اچھا! ہوا ہے تو ہوا کرے' میرا اس سے کیا تعلق؟ لیکن دین میں' اصل حیثیت اس تعلق کو حاصل ہے جو بندے اور خدا کے درمیان' جو ہمارے اور عالم غیب کے درمیان برقرار ہوتا ہے۔ دین ایک طرف تو ہمیں عمل اور کوشش پر ابھارتا ہے اور (امیر المومنین کے الفاظ میں) خدمت پر' اور دوسری طرف کہتا ہے غیب اور یہاں کے درمیان معنوی تعلق اور روابطے پائے جاتے ہیں۔ تم دعا کرو' تم طلب کرو' تم مدد کی درخواست کرو' (اس طرح) تم ایک پوشیدہ راستے سے' جسے تم خود بھی نہیں جانتے' اپنے مقصد اور نتیجے تک پہنچ جاؤ گے۔ کہتا ہے صدقہ دو' وہ ایک پوشیدہ راستے سے جسے تم نہیں جانتے بلاؤں کو دور کر دے گا۔ دعا کرو (البتہ اس کی شرائط ہیں' اگر دعا ان شرائط کے ساتھ کی جائے تو) ایک پوشیدہ راستے سے آپ کے لئے اسکی قبولیت ہو جائے گی۔ ارادہ کرو' اپنے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو' آپ دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ ایک مخصوص موقع پر' مشکل گھڑی میں' آپ کے دل میں ایک بات ڈال دے گا۔ آپ کو غیب سے مدد پہنچ جائے گی۔

غیبی امداد کا ایک قاعدہ ہے

البتہ غیبی امداد کی کچھ شرائط ہوتی ہیں' اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنے گھر میں بیٹھے رہیں اور کہیں کہ اے غیب آ اور میری مدد کر! نہیں' غیبی امداد قانون اور شرائط رکھتی ہے۔ لہٰذا اہم بات یہ ہے کہ ہم غیب پر اور خاص شرائط میں غیبی امداد پر ایمان رکھیں۔

بنیادی طور پر خود وحی غیبی امداد ہے' لیکن اجتماع انسانی کے پیمانے پر۔ جس مقام پر انسانی علم' انسانی عقل' انسانی عمل کی دسترس نہیں ہو سکتی' جس مقام پر حس نہیں پہنچ سکتی' عقل اور فکر نہیں پہنچ سکتے' وہاں اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے ذریعے' جو "پیغمبر" کہلاتے ہیں' انسان کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے' اُسے غیب سے مدد پہنچاتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

وہ مقام جہاں انسان عاجز و ناتواں رہتا ہے اب جبکہ انسان اپنی کوششیں کر چکا ہوتا ہے اپنا کام انجام دے چکا ہوتا ہے اب ناتواں ہے اس کی قدرت میں نہیں ہے یہ غیبی امداد کا مقام ہے۔

قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے: وَ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (۱)

اے لوگو! اللہ کی اس نعمت کو فراموش نہ کرو کہ تم (یعنی تم لوگ، تم انسان نہ صرف تم عرب بلکہ تمام انسان) ایک انتہائی خطرناک گھاٹی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور عنقریب یقینی طور پر گرنے والے تھے کہ ایسے میں خدا نے اس پیغمبر کے ذریعے تمہیں نجات دی تمہیں آزادی دی تمہاری گلوخلاصی کی۔ یہ غیبی امداد ہے اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے یہ ایمان انتہائی مفید اور محافظ ہے!

مجھے نہیں معلوم آپ کا سامنا ایسے لوگوں سے ہوا ہے یا نہیں میرا سامنا ہوا ہے اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایسے تجربے مجھے ہوئے ہیں کہ بسا اوقات انسان اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر وہ اس راستے پر چلے جسے اللہ نے اس کے لئے معین کیا ہے تو اسکی عقل و فہم اور فکر سے بالاتر کچھ تائیدیں، کچھ غیبی اور خفیہ حمایتیں ہیں جو اس کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اس قسم کا ایمان کس قدر انسان کی حفاظت کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے کتنا مفید ہے۔

آیت اللہ بروجردی کی داستان اور مشہد جانا

ایک واقعہ ابھی مجھے یاد آیا ہے اگر اسے نہ سناؤں تو افسوس رہے گا، مجھے یاد ہے کہ دو ایک مرتبہ اسے اپنی تقریروں میں سنا بھی چکا ہوں۔ یہ قصہ آیت اللہ بروجردی (اعلی اللہ مقامہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے قم آنے سے پہلے ہی میرے ان سے ارادت پر مبنی قریبی تعلقات تھے۔ میں بروجرد گیا تھا اور وہاں ان کی خدمت میں ہوا کرتا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک متقی اور سچے موحد انسان تھے۔ آپ حضرات یہ نہ کہیے گا کہ جو کوئی بھی مرجع تقلید بنے گا وہ موحد تو ہوگا۔ توحید کے بھی درجات ہیں۔ جی ہاں، اگر ہم اور آپ سے موازنہ کیا جائے تو مراجع تقلید ہماری اور آپ کی توحید سے کہیں زیادہ بلند درجے پر توحید کے حامل ہوتے ہیں، لیکن جب میں موحد کہتا ہوں تو ایک بہت عالی درجے کے بارے میں کہہ رہا ہوتا ہوں۔ وہ ایسے شخص تھے جو اپنی زندگی میں توحید کو لمس کرتے تھے انہیں خدا کی مدد و حمایت پر عجیب انداز کا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ قم میں آمد کا ان کا پہلا سال تھا، وہ مشہد جانے کا ارادہ رکھتے تھے، شاید انہوں نے منت سی مانی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ بیمار ہوئے تھے (وہ مشہور بیماری جس میں آپریشن کی ضرورت پیش آئی تھی اور انہیں بروجرد سے تہران لا کر آپریشن کیا گیا تھا اور بعد میں علمائے قم کی درخواست پر وہ قم تشریف لے گئے) انہوں نے دل میں نذر کی ہوئی تھی کہ اگر خدا انہیں شفا عنایت فرمائے تو وہ امام رضا علیہ السلام کی زیارت کے لئے جائیں گے۔ چھ ماہ قم میں رہنے کے بعد، گرمیاں آ گئیں تو انہوں نے مشہد جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوستوں اور اصطلاحاً اپنے اصحاب سے ذکر کیا کہ "میں مشہد جانا چاہتا ہوں آپ میں سے جو کوئی میرے ساتھ چلنا چاہتا ہے وہ بتا دے"۔ اصحاب نے کہا ٹھیک ہے ہم آپ سے عرض کر دیں گے۔ ان کے ایک خاص ساتھی، جو اس وقت ایک مرجع تقلید ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم حلقہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے، بحث کر رہے تھے، سوچ رہے تھے کہ آقائے بروجردی کا مشہد جانا خلاف مصلحت ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم انہیں جانتے تھے، لیکن اُس زمانے میں ابھی تہران کے لوگ انہیں نہیں جانتے تھے، خراسان کے لوگ اُن سے واقف نہیں تھے اور مجموعی طور پر ایران کے لوگ انہیں نہیں پہچانتے تھے لہٰذا وہ عزت و احترام جس کی یہ عظیم ہستی حقدار ہے وہ نہیں ہوگا۔ ابھی رہنے دیں، دو ایک سال اور یہیں رہیں۔ اپنی نذر کے لئے انہوں نے صیغہ تو پڑھا نہیں ہے، جس کی وجہ سے وہ نذر شرعی ہو گئی ہو، اپنے دل ہی میں انہوں نے یہ نیت کی ہے۔ جب وہ مشہور ہو جائیں اور ایران کے لوگ انہیں پہچاننے لگیں، تو اپنے شایان شان عزت و احترام

۱۔ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی، تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں نکال لیا۔ (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۰۳)

jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

کے ساتھ تشریف لے جائیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر انہوں نے دوبارہ فرمایا' تو ہم ان کو اس ارادے سے باز رکھیں گے۔

چند دن بعد محفل کے دوران آیت اللہ بروجردی نے دوبارہ فرمایا: آپ لوگوں میں سے کون میرے ساتھ چلے گا؟ آپ کے تمام دوستوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ کیا۔ کسی نے کہا: حضور آپ ابھی ابھی بیماری سے اٹھے ہیں (اس وقت صرف گاڑی ہوا کرتی تھی' ہوائی جہاز نہیں تھا) آپ کو تکلیف ہوگی' ممکن ہے ٹانکے کھل جائیں۔ دوسرے نے کوئی اور چیز کہی۔ لیکن ایک ساتھی کی زبان سے بات نکل گئی کہ آپ کو کیوں مشہد نہیں جانا چاہئے۔ انہوں نے کوئی ایسا جملہ کہہ دیا جس سے وہ سمجھ گئے کہ یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں کہ میں مشہد نہ جاؤں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ابھی ایران کے لوگ آپ کو نہیں پہچانتے ہیں' اور جس عزت و احترام کے آپ حقدار ہیں وہ نہیں ہوگا۔ ان صاحب نے مجھے بتایا کہ جیسے ہی آقائے بروجردی نے یہ جملہ سنا' لرز اٹھے (اس وقت ان کی عمر ستر سال تھی) کہنے لگے: میں نے اللہ سے ستر برس کی عمر پائی ہے اور اس مدت میں اللہ نے مجھ پر بہت سے فضل کئے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایک فضل بھی میری تدبیر سے نہیں بلکہ تقدیر سے ہوا ہے۔ میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ دیکھوں خدا کی راہ میں میری ذمے داری اور فریضہ کیا ہے؟ کبھی بھی اس بات کی فکر نہیں کی کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں' اس پر چلتے ہوئے ترقی کروں گا یا تنزلی' میری شخصیت اونچی ہوگی یا نہیں۔ میری سوچ ہمیشہ یہ تھی کہ اپنی ذمے داری ادا کر دوں' آگے جو بھی ہو وہ تقدیر الٰہی ہے۔ حیف ہے کہ اب ستر سال کی عمر میں خود اپنے لئے کوئی تدبیر کروں۔ جب میرا خدا ہے' جب مجھ پر خدا کی عنایت ہے' جب میں اپنے آپ کو ایک بندے اور ایک فرد کی صورت میں دیکھتا ہوں' تو خدا بھی مجھے فراموش نہیں کرے گا۔ نہیں' میں (مشہد) جاؤں گا۔

ہم نے دیکھا کہ جب یہ مرد الٰہی فوت ہوا' روز بروز خدا نے ان کی عزت میں اضافہ کیا۔ کیا آیت اللہ بروجردی کی نعوذ باللہ خدا سے کوئی رشتے داری تھی جو ان پر اللہ کا فضل و عنایت ہوئی؟ ہرگز نہیں! افراد کے لئے' معاشرے کے لئے اور انسانیت کے لئے خدا کی امداد کا ایک قاعدہ ہے۔

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہدی موعود (عجل اللہ فرجہ الشریف) کے بارے میں فرمایا ہے: یُبْعَثُ فِیْ اُمَّتِیْ عَلٰی اخْتِلَافٍ مِنَ النَّاسِ وَ زَلَازِلَ ... یَرْضٰی عَنْهُ سَاكِنُ السَّمَاءِ وَ سَاكِنُ الْاَرْضِ وَ یُقَسِّمُ الْمَالَ صِحَاحاً. قَالُوا: وَ مَا صِحَاحاً یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: یُقَسِّمُ بَیْنَهُمْ بِالسَّوِیَّةِ. (۱) خدا نے دنیا کو کبھی لاوارث نہیں چھوڑا ہے' اور لاوارث چھوڑے گا بھی نہیں۔ جس وقت دنیا ایسے مقام پر پہنچے گی کہ واقعاً انسانیت کو خطرہ لاحق ہوگا' تو خدا انسانیت کو ایک انسان کے ذریعے نجات دے گا۔

روشن فکر حضرات میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں بدگمانی

کیا آپ جانتے ہیں کہ آج دنیا کے روشن فکر حضرات میں انسانیت کے مستقبل کے بارے میں کتنی بدگمانی پیدا ہو چکی ہے' اور کیا آپ واقف ہیں کہ یہ بدگمانی ظاہری علل و عوامل کے لحاظ سے درست بھی ہے؟

ہم مسلمان اس نعمت کے قدر شناس نہیں ہیں کہ آج بھی سو سال پہلے کے لوگوں کی طرح کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی مثلاً مزید پانچ سو سال تک' مزید ہزار سال تک رہے گی اور شاید مزید ایک لاکھ سال بھی رہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ انسانی زندگی نہ ہوگی' اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ انسانیت ختم ہو رہی ہے۔ لیکن آج دنیا کے کچھ اصطلاحاً روشن فکر حضرات (ان ہی میں سے ایک رسل' اپنی کتاب امید ہائے نو میں) اس بات کے معتقد ہیں کہ انسانیت نے اپنا وقت پورا کر لیا ہے' اور اس کے خاتمے کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔

ایک اور شخص جو انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ایسی ہی بدگمانی کا شکار ہے وہ آئن

۱۔ (میں تمہیں مہدی کی بشارت دیتا ہوں) جسے اس وقت بھیجا جائے گا جب لوگ اختلاف اور زلزلوں میں مبتلا ہوں گے ..... اہل آسمان اور اہل زمین ان سے خوش ہوں گے۔ وہ مال کو صحیح طریقے سے تقسیم کریں گے۔ ایک شخص نے دریافت کیا: صحیح طریقے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ان کے درمیان مساوی طور پر مال تقسیم کریں گے۔ (منتخب الاثر' ف ۲' ب ۱' ح ۱۴)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہت قوی امکان ہے کہ انسان ایک حیرت انگیز مہارت کے ذریعے اپنے آپ کو مکمل طور پر نابود کر لے گا۔ کیونکہ پیداوار کے لحاظ سے تخریبی قوتیں ایسے مقام پر پہنچ چکی ہیں کہ انہوں نے انسانیت کو ختم کرنے کی طاقت حاصل کر لی ہے۔ ماضی میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

گزشتہ زمانے میں خطرناک ترین شخص، محبوب ترین افراد اگر ان کے پاس اُس زمانے کی سب سے بڑی قوت بھی ہوتی تھی، تو وہ کیا کر سکتے تھے؟ مثلاً ایک لاکھ یا پچاس ہزار انسانوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: واہ واہ! دیکھو حجاج بن یوسف نے تیس ہزار افراد کو قتل کیا! وہ اس سے زیادہ افراد کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانے کی ترقی اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ آخر تلوار اور جلاد کی طاقت سے گردن اڑا کر، پیٹ چاک کر کے، کتنے لوگوں کو مارا جا سکتا تھا؟ اگر انسان بیس سال بھی حکومت کرے اور روزانہ تین چار آدمیوں کو بھی قتل کرے، تو تیس ہزار سے زیادہ تو نہیں ہو سکتے۔ یا روم کا وہ خونخوار بادشاہ نیرز زیادہ سے زیادہ کیا ظلم کر سکتا تھا؟ فطرتاً قیس القلب ہو تب بھی جاتا اور ایک بلندی پر کھڑا ہوتا اور کہتا کہ اس شہر کو جلا کر راکھ کر دو۔ شہر کو آگ لگا دی جاتی، اس کی حدت شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی، اور وہ یہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا۔ لیکن کیا وہ پوری دنیا کو آگ لگا سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر کیا اس دور میں جس شہر کو آگ لگائی جاتی کیا وہ تہران جتنا بڑا ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس زمانے کے وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ تہران کی مانند وسعت اور عظمت رکھنے والا شہر اور اس سے بھی بڑے شہر جدید ترقی کی پیداوار ہیں۔ لیکن آج انسان ترقی میں ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اگر کوئی نیرز پیدا ہو جائے، دنیا کی کوئی سپر طاقت پیدا ہو جائے اور کسی کے دماغ پر ایک لمحے کے لئے جنون طاری ہو جائے، تو پوری انسانیت تباہ و برباد ہو جائے۔

جرمن چانسلر نے کہا ہے کہ اگر تیسری عالمی جنگ چھڑ گئی تو نہ کوئی غالب رہے گا اور نہ کوئی مغلوب۔ اب تک جنگوں میں ایک غالب ہوتا تھا اور ایک مغلوب۔ لیکن اگر دنیا کی سپر طاقتوں کے درمیان ایک اور عالمی جنگ چھڑ گئی تو نہ کوئی غالب ہوگا اور نہ مغلوب۔ یعنی غالب اور مغلوب دونوں ختم ہو جائیں گے۔

واقعاً ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے کونسی بات صحیح ہے؟

بدگمان لوگوں کی بات صحیح ہے۔ اگر ہم دیکھیں تو واقعاً آج دنیا بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے بارود کے ڈھیر سے بھی زیادہ خطرناک (اب بارود کی حیثیت کیا ہے؟ بارود کے ڈھیر سے سو گنا زیادہ خطرناک) اور اس کا خاتمہ چند بٹن دبانے کا محتاج ہے۔ لہٰذا انہی لوگوں کی بات درست ہے جو دنیا کے مستقبل کی طرف سے بدگمان ہیں۔ سچ کہ ظاہری علل و اسباب کے اعتبار سے کوئی دلیل بھی نہیں ہے کہ ہم بدگمان نہ ہوں۔ بدگمان ہونا بھی چاہئے۔ ہمیں اس بات کی امید نہیں رکھنی چاہئے کہ ہمارے بچے ایک طبعی اور معمول کی عمر پائیں گے اور اپنے بچوں کو دیکھیں گے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسان چاند پر جا رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ رفتہ رفتہ وہاں سکونت اختیار کر لے گا اور اگر کسی جنونی کا دماغ چل گیا، تو وہ وہاں سے زمین کو نابود کر دے گا۔ صرف ایک چیز ہے، اور وہ دین سے حاصل ہونے والا سبق ہے: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ. ہم کہتے ہیں، البتہ ماضی میں انسانیت کے لئے چھوٹے پیمانے پر (قبیلے یا ملک کی سطح پر) یا کچھ زیادہ بڑے پیمانے پر (ایک بڑے علاقے کے لئے) اس قسم کے خطرات پیش آئے ہیں، لیکن دنیا کا ایک مالک ہے جس کا نام خدا ہے۔ خداوند عالم نے ایک وسیلے کے ذریعے اسکی حفاظت کی ہے۔ اگر کبھی کوئی خطرہ عالمی پیمانے پر پیش آئے گا، تب بھی لطف الٰہی دنیا سے اٹھ نہیں جائے گا۔ گاندھی نے کیا خوب کہا ہے، وہ کہتا ہے، یورپ جنون اور ذہانت کا مجموعہ ہے، وہاں کے غیر معمولی ذہین افراد جنونی بھی ہیں۔ ان میں ذہانت کے ساتھ ساتھ جنون بھی پایا جاتا ہے۔

روشن مستقبل دین کی نظر میں

دین کی منطق کے لحاظ سے، اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے اعتبار سے، ظاہری اصولوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ دینی ذرائع سے حاصل شدہ خبروں کی منطق کے لحاظ سے، ہم کہتے ہیں کہ ہمیں انسانیت کے مکمل طور پر نیست و نابود ہو جانے کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں۔ جو کچھ ماضی میں وقوع پذیر ہوا وہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات [illegible] ایسا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

مستقبل ہے جس میں اسلامی تعبیر کے مطابق عقلیں کامل ہو جائیں گی۔ حدیث ہے کہ خداوند متعال (یہ نہیں کہا کہ امام زمان) اُس زمانے میں اپنا دستِ لطف بندوں کے سر پر رکھ دے گا اور حتیٰ کَمُلَتْ عُقُوْلُهُمْ. (۱) انسان اپنی عقل کو پالے گا اور پھر اُس سے یہ بے عقلیاں سرزد نہیں ہوں گی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عمریں زیادہ طویل اور لوگ مکمل طور پر صحت مند ہوں گے اور کامل امن وامان برقرار ہوگا: تَصْطَلِحُ فِیْ مُلْکِهِ السِّبَاعُ. (۲) درندوں کے درمیان صلح ہو جائے گی' کوسیگن اور جانسن (روس اور امریکہ کے سابق صدور) بھی آپس میں صلح کر لیں گے۔ یُخْرِجُ الْاَرْضُ اَفْلَاذَ کَبِدِهَا. (۳) زمین میں توانائی کے اس قدر ماخذ اور ذخیرے موجود ہیں کہ الٰی ماشاء اللہ۔ ابھی آپ کو معلوم ہی کیا ہے؟! آپ کہتے ہیں کہ چار پانچ ارب کی آبادی بہت زیادہ ہے؟ نہیں جناب' زمین اس سے بھی زیادہ کو جگہ دے سکتی ہے۔ زمین کے اندر جتنی زیادہ سے زیادہ توانائی ہے' اس میں جو مدفون خزانے موجود ہیں' وہ سب انسان کے حوالے کر دے گی' آسمان اپنی برکتوں کی برسات کر دے گا۔

جب ہم دینی تعلیمات کی بنیاد پر' ان چیزوں کی بنیاد پر مطالعہ کرتے ہیں اور آج کی روشن کہلائی جانے والی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہماری مثال اس دنیا کی نسبت جس کی دین' ہمیں نوید دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک ایسی دنیا ہمارے انتظار میں ہے (خواہ ہم ذاتی طور پر اسے پاسکیں یا نہ پاسکیں) ان لوگوں کی مانند ہے جو ایک سرنگ عبور کر رہے ہوں' وہ سرنگ بذاتِ خود تو تاریک ہو لیکن مصنوعی چراغ اس کے اندر نصب کئے گئے ہوں۔ اور جب وہ اس سرنگ سے باہر نکلیں تو ایک بہت کھلی اور قدرتی طور پر روشن فضا میں پہنچ جائیں' جہاں صحیح معنی میں عدالت برقرار ہوگا' جہاں صحیح معنی میں امن وامان قائم ہوگا' جہاں سچی آزادی میسر ہوگی' توحید اپنی حقیقت کے ساتھ طلوع کرے گی' ظاہر ہوگی اور دنیا کو روشن کرے گی۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ

۱۔ منتخب الاثر۔ ف ۷۔ ب ۱۲۔ ح ۱

۲۔ منتخب الاثر۔ ف ۹۔ ب ۱۔ ح ۴

۳۔ منتخب الاثر ۔۔۔

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا. (۱)

قرآن کہتا ہے کہ: جان لو کہ خدا اسی مردہ زمین کو بہار کے موقع پر زندہ کرتا ہے۔ ہماری احادیث میں اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ یہ بات اس خاکی زمین سے مختص نہیں ہے' انسانی معاشرے کی زمین بھی اسی طرح سے ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ ایک دن فساد پورے عالم پر چھا گیا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ. (۲) اگر پوری دنیا اس طرح مر جائے جیسے موسم خزاں میں درخت اور پودے مر جاتے ہیں' تب بھی مایوس نہ ہونا۔ یہ نہ کہنا کہ دنیا پر خزاں چھا گئی ہے' اب کبھی بہار نہیں آئے گی۔ نہیں' بہار ضرور آئے گی۔

یہ ہیں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنی' غیب پر ایمان اور غیبی اور خفیہ امداد پر ایمان کے معنی۔ البتہ یہ امداد فرد کے لئے انفرادی سطح پر' ایک چھوٹی سوسائٹی کے لئے اس کی سطح پر اور عالم انسانیت کے لئے عالمی سطح پر ہوتی ہے۔ مکمل عدالت' مکمل امن وامان' مکمل برکت' مکمل رفاہ' مکمل آسائش' مکمل خیر اور مکمل ترقی کے ساتھ ایک واحد عالمگیر حکومت قائم ہوگی۔

اپنی عرائض کے اختتام پر ہم دعائے افتتاح کے ان جملوں کو پڑھتے ہیں جو شاید آپ میں سے اکثر کو حفظ ہوں:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیْکَ فِیْ دَوْلَةٍ کَرِیْمَةٍ تُعِزُّ بِهَا الْاِسْلَامَ وَاَهْلَهٗ وَتُذِلُّ بِهَا النِّفَاقَ وَ اَهْلَهٗ وَ تَجْعَلُنَا فِیْهَا مِنَ الدُّعَاةِ اِلٰی طَاعَتِکَ وَالْقَادَةِ اِلٰی سَبِیْلِکَ وَ تَرْزُقُنَا بِهَا کَرَامَةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ." (۳)

۱۔ یاد رکھو کہ خدا مردہ زمینوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۱۷)

۲۔ لوگوں کے اپنے اعمال کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ چھا گیا ہے۔ (سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۴۱)

۳۔ بارالٰہا! ہم تجھ سے ایک ایسی محترم حکومت کی آس لگائے ہوئے ہیں جس کے ذریعے اسلام و مسلمین عزت حاصل کریں اور نفاق اور منافقین ذلیل ہو جائیں۔ اور ہمیں اس حکومت حق میں اپنی طرف دعوت دینے والا قرار دے اور اپنے راستے کی طرف قیادت کرنے والا بنادے اور ہم کو دنیا اور آخرت کی بزرگی عنایت فرما۔ (اقتباس از دعائے افتتاح)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

خدایا! ہم تجھے اس شب کے صاحب کے حق کی قسم دیتے ہیں کہ ہمیں اہل ایمان میں سے اور اُن کے فرج کے سچے منتظرین میں سے قرار دے۔

ہمیں دامنِ ولائے اہلِ بیت اور ان کی حقانیت پر ایمان سے دور نہ فرما۔

خدایا! ہمیں دینِ مقدسِ اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔

ہم سب کو عمل کی توفیق اور نیت کا خلوص عنایت فرما۔

وَ صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ

☆......☆......☆

معیارِ انسانیت کیا ہے؟☆

اگرچہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں نے اپنی توانائی اور گنجائش سے زیادہ اپنے لیے کام بڑھا لئے ہیں' یا حالات نے مجھ پر مسلط کر دیئے ہیں' اسکے باوجود جب احباب نے مجھ سے اس مقام پر ایک تقریر کا تقاضا کیا' تو میں نے اُن سے اتفاق کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ پایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بیٹھنا' باتیں کرنا اور آپ طالب علموں کے ساتھ اسلامی مسائل پر گفتگو کرنا میرے لئے اہم ترین بات ہے۔

میں ترجیح دوں گا کہ ایک ایسے مسئلے پر بات کروں جو آپ کے ذہن کو اس بات پر آمادہ کرے کہ آپ اس پر غور و فکر اور ایک دوسرے سے گفتگو کریں۔ لہٰذا میری گفتگو زیادہ تر سوال اٹھانے اور مسئلے کی جانب متوجہ کرنے کے پہلو کی حامل ہوگی۔ گفتگو کا موضوع "معیارِ انسانیت" ہے۔ یعنی ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسانیت کا معیار اور پیمانہ کیا ہے؟

اگر ہم حیاتیات کے لحاظ سے معیارِ انسانیت کو جاننا چاہیں تو یہ ایک سادہ اور معمولی کام ہے۔ حیاتیات (Biology) میں صرف انسانی جسم پیشِ نظر ہوتا ہے۔ وہاں اس بات پر بحث کی جاتی ہے کہ حیوانات کی مختلف درجہ بندیوں (classifications) میں سے انسان کس درجہ

☆۔ یہ تقریر ایران کی ایک یونیورسٹی میں کی گئی تھی۔ یونیورسٹی کا ... آقای ...

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

بندی میں آتا ہے' مثلاً کیا دودھ پلانے والا جاندار ہے یا کسی اور خصوصیت کا حامل ہے وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ جانداروں کی مختلف انواع میں سے ایک نوع کو "انسان" کہتے ہیں۔ اسکے مقابل دوسرے جاندار ہیں جیسے پرندے' رینگنے والے جانور' چوپائے اور حشرات وغیرہ۔

حیاتیات کے اعتبار سے اس زمین پر رہنے والے وہ تمام افراد بشر انسان ہیں جو دو پیروں سے چلتے ہیں' جن کے ناخن چوڑے ہوتے ہیں اور جو گفتگو کرتے ہیں۔ اس معیار کے تحت انسانوں کے درمیان حیاتیات کے اعتبار سے انسانیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حیاتیات کے اعتبار سے' طبی اعتبار سے' حتیٰ نفسیاتی اعتبار سے موسیٰ چمبا اتنا ہی انسان ہے جتنا لومبا۔ یعنی حیاتیات کے پہلو سے' ایک طبیب کی نظر میں' حتیٰ ایک نفسیات دان کی نظر میں' جو انسانی بدن کے اعضا اور انسانی نفسیات کے ارکان پر بحث کرتے ہیں ان دو افراد کے درمیان کوئی فرق قرار نہیں دیا جا سکتا' اسی طرح جیسے (ان حوالوں سے) امام حسین علیہ السلام اور یزید کے درمیان کوئی فرق قائم نہیں کیا جا سکتا' دونوں ہی حیاتیات کے اعتبار سے' طبی لحاظ سے' حتیٰ نفسیاتی حوالے سے انسان ہیں۔

لیکن کیا انسان کی انسانیت' وہ جسے شرافت اور انسانی کمال کا نام دیا جاتا ہے' انہی چیزوں سے ہے؟

انسانِ کامل اور انسانِ ناقص

علومِ انسانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسانِ کامل اور انسانِ ناقص کی بات کی جاتی ہے۔ پسماندہ انسان اور ترقی یافتہ اور متعالی انسان کی گفتگو کی جاتی ہے۔ وہ انسان جو انسانی علوم کے اعتبار سے' اخلاقی علوم کے اعتبار سے' اجتماعی علوم کے حوالے سے ممکن ہے کامل ہو اور ممکن ہے ناقص ہو' وہ قابل ستائش اور تعریف و تکریم کے قابل ہو یا کسی بھی صورت میں ستائش و تعظیم کے قابل نہ ہو' بلکہ تحقیر کے قابل ہو' وہ کونسا انسان ہے؟

انسانیت کا معیار کیا ہے اور کس چیز میں ہے؟

مثلاً کس طرح سے ہم چمبا اور لومبا کے درمیان فرق قائم کر سکتے ہیں؟

ان کی کس چیز سے فرق کا تعین کر سکتے ہیں؟

وہ کونسی چیز ہے جو ایک کو پست' قابل مذمت اور حتیٰ مار ڈالنے کے لائق قرار دیتی ہے اور دوسرے کو قابل ستائش؟

حالانکہ اگر حیاتیاتی اعتبار سے دونوں کا پوسٹ مارٹم کیا جائے' تو دونوں ایک ہی جیسے ہیں' حتیٰ اُن کے نفسیاتی اراکین بھی ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ دونوں کے پاس دل' اعصابی نظام' جگر' گردے' پھیپھڑے' معدہ وغیرہ ہیں اور ممکن ہے قابل مذمت انسان کے اعضائے بدن قابل ستائش انسان کے اعضائے بدن سے بہتر کام کرتے ہوں۔

پس پھر کیا چیز اس میں ہے اور کونسی اُس میں' جو ان دونوں کے درمیان فرق کا سبب ہے؟

یہ وہی انتہائی اہم مسئلہ ہے جو قدیم زمانے سے علومِ انسانی اور ادیان و مذاہب میں موضوعِ بحث رہا ہے۔ مثلاً قرآن مجید بعض انسانوں کو فرشتوں سے برتر' بالاتر اور مسجودِ ملائکہ قرار دیتا ہے' جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ لیکن بعض انسانوں ہی کے بارے میں کہتا ہے کہ چوپائے ان سے بہتر ہیں۔

وہ کونسے معیار اور کونسے پیمانے ہیں جن کی وجہ سے اتنا بڑا فرق پیدا ہوا ہے؟

یہ حتیٰ دین و مذہب سے بھی تعلق نہیں رکھتا' اور حتیٰ انسان کا مسئلہ ایک ایسے مرحلے پر ہے کہ خدا کے موضوع کے ساتھ بھی سو فیصدی وابستہ نہیں ہے۔ یعنی دنیا کے مادہ پرست فلسفی بھی جو خدا اور دین و مذہب پر ایمان نہیں رکھتے' انہوں نے بھی انسان و انسانیت اور بلند انسان اور پست انسان کا مسئلہ اٹھایا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادی مکاتب کی نظر میں کس قسم کے انسان بلند انسان ہیں اور کونسے انسان پست انسان ہیں؟ اور بلندی اور پستی کا پیمانہ کیا ہے؟

یہ تھا سوال اور اب دیکھتے ہیں کہ اس کا جواب کیا ہے؟

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

معیارِ انسانیت کے بارے میں مختلف نظریات

۱: علم

کیا ہم علم کو انسانیت کا معیار اور کسوٹی قرار دے سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسان حیاتیات کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مساوی ہیں' لیکن ایک چیز ہے جو اکتسابی یعنی حاصل کی جاسکنے والی ہے اور اس معیار کے مطابق انسانیت اور غیر انسانیت کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ بلند اور پست انسان کے درمیان ایک سرحد ہے' اور وہ (سرحد) علم ہے' جتنا انسان کی معلومات اور اسکا علم زیادہ ہوگا اُس میں اتنی ہی زیادہ انسانیت ہوگی۔ اور جتنا وہ علم و دانش سے محروم ہوگا' اتنا ہی انسانیت سے بے بہرہ ہوگا۔

لہٰذا پہلی جماعت کا بچہ' اُس بچے سے زیادہ انسانیت کا حامل ہے جو ابھی اسکول نہیں گیا ہے۔ دوسری جماعت کا طالب علم پہلی جماعت کے طالب علم سے زیادہ انسانیت رکھتا ہے اور اسی طرح۔۔۔ یونیورسٹی کے مرحلے میں بھی جو طالب علم آخری سال میں ہے وہ ابتدائی برسوں کے طالب علم سے زیادہ انسانیت کا حامل ہے۔ علما اور دانشوروں میں بھی ایسا ہی ہوگا کہ جس کی معلومات زیادہ ہیں وہ زیادہ انسانیت کا حامل ہے۔

کیا یہ بات قابلِ قبول ہوسکتی ہے کہ علم و دانش انسانیت کا معیار ہے' یہی نہیں بلکہ واحد معیار ہے؟

کیا آپ انسانوں کی تعریف یا مذمت اُن کے علم و دانش کی بنیاد پر کرتے ہیں؟

آپ جو ابوذر کی تعریف کرتے ہیں' تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوذر کا علم آپ کے علم سے اور ان کے زمانے کے تمام لوگوں کے علم سے زیادہ تھا؟ یہ جو آپ معاویہ کی مذمت اور اُن کے مقابلے میں ابوذر کی تعریف کرتے ہیں' کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے حساب لگایا ہے اور دیکھا ہے کہ ابوذر کی معلومات معاویہ سے زیادہ ہیں؟

[illegible] کے بارے میں کیا خیال ہے؟

http://fb.com/ranajabirabbas

ہم نہیں سمجھتے کہ صرف علم و دانش معیارِ انسانیت ہوگا اور جو بھی زیادہ عالم ہے وہ زیادہ انسانیت کا حامل ہے۔ اس معیار کے مطابق تو ہمیں کہنا چاہیے کہ ہمارے زمانے میں آئن اسٹائن (جس کی شہرت دنیا کے تمام دانشوروں سے زیادہ ہے اور واقعاً شاید وہ دنیا کے تمام دانشوروں سے زیادہ عالم بھی تھا) ہمارے زمانے کے انسانوں میں سب سے زیادہ انسانیت کا حامل تھا۔

۲: اخلاق و عادات

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانیت علم سے وابستہ نہیں ہے' البتہ علم انسانیت کے لئے ایک شرط ہے۔ آگہی رکھنے اور باخبر ہونے' دنیا کے بارے میں' اپنے بارے میں اور معاشرے کے بارے میں معلومات رکھنے کی نفی نہیں کی جاسکتی لیکن یقینی طور پر یہ کافی نہیں ہے' اگر اسے دخل حاصل ہو تب بھی یہ انسانیت کا ایک رکن ہے۔ مزید یہ کہ خود اس کا رکن ہونا بھی قابلِ بحث ہے' جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ انسانیت کا تعلق علم و دانش سے نہیں اخلاق و عادات سے ہے۔ اخلاق و عادات ایک مسئلہ ہیں اور علم و دانش دوسرا مسئلہ۔ ممکن ہے انسان عالم اور دانشور ہو اور بہت کچھ جانتا ہو' لیکن اس کا اخلاق اور اس کی عادات انسانی اخلاق و عادات نہ ہوں' بلکہ حیوانی اخلاق و عادات ہوں۔

کس طرح؟

ایک حیوان اخلاق و عادات کے لحاظ سے اُن جبلتوں (فطری خواہشات' Instincts) کا تابع ہوتا ہے جن کے ساتھ وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جبلتوں کا جبر اس پر حکومت کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنی جبلت کے مقابل ایک مضبوط قوتِ ارادی کا مالک نہیں ہوتا' حتیٰ وہ صرف اپنی جبلت ہی بن کے رہ جاتا ہے اور جبلت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اگر ہم کہیں کہ کتا ایک درندہ اور ساتھ ہی ساتھ ایک وفادار جانور بھی ہے' تو درندگی اور وفاداری اس حیوان کی جبلت ہے۔ اگر ہم کہیں کہ چیونٹی ایک لالچی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رکھنے والا حیوان ہے' تو اس کی لالچ اور دوراندیشی اس کی ایک جبلت ہے۔ وہ اپنی جبلت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے تابع ہوتی ہے اور بس۔

دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جو انہی حیوانی اخلاق و عادات کے مالک ہیں یا دوسرے الفاظ میں انہی ابتدائی فطری اخلاق و عادات کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو انسانی بنیاد کے مطابق تعمیر نہیں کیا ہے اپنی تربیت نہیں کی ہے وہ ایک فطری انسان ہیں فطرت سے سو فیصد ہم آہنگ انسان ہیں ایسے انسان ہیں جو اپنے اندر اپنی فطرت کے محکوم ہیں۔

ان کے علم کی کیا کیفیت ہے؟

علم آگہی اور چراغ ہے۔ اپنی فطرت کے محکوم ہونے کے باوجود ان کے پاس علم کا چراغ بھی ہے۔ اس وقت ان کے اور حیوان کے درمیان فرق اس پہلو سے ہوگا کہ حیوان کے پاس اپنی جبلتوں (فطری خواہشات) پورا کرنے کے لئے معلومات کمزور اور اس کے زمان و مکان میں محدود ہوتی ہیں لیکن انسان کا علم اسے یہ طاقت فراہم کرتا ہے کہ وہ گزشتہ زمانے کی معلومات حاصل کرتا ہے آئندہ کی پیش بینی کرتا ہے اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے علاقوں میں جا پہنچتا ہے یہاں تک کہ اپنے سیارے سے بھی نکل کر دوسرے سیاروں میں پہنچ جاتا ہے۔

لیکن اخلاق و عادات کا مسئلہ ایک دوسری چیز ہے علم و دانش کے مسئلے سے ہٹ کر ہے۔ بالفاظ دیگر علم و دانش کا تعلق انسان کی تعلیم سے ہے اور اخلاق و عادات کا تعلق انسان کی تربیت سے۔ اگر انسان کو آگہی دینا چاہیں تو ضروری ہے کہ اسے تعلیم فراہم کریں اور اگر اسے خاص قسم کے اخلاق و عادات سے آراستہ کرنا چاہیں تو اسی انداز سے اسکی تربیت کرنی ہوگی اسے عادت اور پرورش دینا ہوگی۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کے عامل (factor) سے ہٹ کر دوسری قسم کے عوامل درکار ہیں۔ ان معنوں میں کہ تعلیم تربیت کی شرط ہے لیکن شرط لازم ہے {جس کا ہونا ضروری ہے} نہ کہ شرط کافی {جس کے بعد کسی اور شرط کی ضرورت نہیں رہتی}۔

پہلا نظریہ جو صرف علم کو انسانیت کا معیار سمجھتا تھا میرے خیال میں وہ کسی طور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ہم بعد میں عرض کریں گے کہ کن لوگوں نے اسی نظریئے کی پیروی کی ہے۔ لیکن دوسرا نظریہ جو اخلاق و عادات کو معیار قرار دیتا ہے اس کے طرفدار زیادہ ہیں۔ لیکن اس وقت یہ مسئلہ درپیش

http://fb.com/ranajabirabbas

ہے کہ کونسے اخلاق و عادات معیار انسانیت ہیں؟ اس بارے میں بھی کئی نظریات پائے جاتے ہیں۔

انسان دوستی

ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ خوبی جو معیار انسانیت ہے وہ محبت اور انسان دوستی ہے۔ اور تمام دوسری خوبیوں کی ماں محبت ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے اخلاق اور عادات کی بنیاد انسان دوستی پر استوار ہو اور وہ انسان دوست ہو تو وہ انسان ہے۔

دوسروں کے مسائل کے بارے میں بھی اپنے مسائل ہی کی طرح سوچنا بلکہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے بارے میں فکرمند ہونا دین کی زبان میں اسے "ایثار" کہتے ہیں۔ ایک کتاب میں تحریر تھا کہ ایک حکم جو دنیا کے تمام ادیان میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ: دوسروں کے لئے بھی وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور دوسروں کے لئے بھی اس چیز کو ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔ ہماری احادیث میں یہ حکم ان الفاظ میں آیا ہے: اَحْبِبْ لِغَيْرِكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَ اكْرَهْ لَهُ مَا تَكْرَهُ لَهَا. (۱) دوسروں کے لئے بھی وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو اور ان کے لئے بھی وہی چیز ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔ یہ منطق محبت کی منطق ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندومت اور عیسائیت میں بھی لفظ "محبت" پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: ہر موقع پر محبت کرو {ان کے یہاں} محبت کے سوا کسی اور مسئلے پر اصلاً بات ہی نہیں ہوتی۔ البتہ ان دونوں مکاتیب میں ایک انحراف پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ محبت کی بات کرتے ہیں لیکن وہ جس محبت کے متعلق بات کرتے ہیں وہ ایک قسم کا نشہ ہے۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے اور بعد میں ہمیں اس پر بحث کرنی چاہئے کہ کیا صرف محبت معیار انسانیت بننے کے لئے کافی ہے یا نہیں؟

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہم نے عرض کیا کہ اخلاق و عادات کے نظریئے میں 'معیار انسانیت' کے حوالے سے جو پہلی چیز سامنے آتی ہے' وہ انسان دوستی ہے۔ اخلاقی انسان یا برتر انسان' بلند تر انسان' ایسا انسان ہے جو انسان دوست ہو۔

اس معیار کے تحت ہماری بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ آپ جو ابوذر کو معاویہ پر ترجیح دیتے ہیں' تو اس ترجیح دینے کی وجہ کیا ہے؟ ہم نے دیکھا کہ پہلے معیار کے تحت' یعنی صرف علم و دانش کو برتری کا معیار سمجھنے کی صورت میں' ہماری یہ ترجیح درست ثابت نہیں ہو رہی تھی لیکن دوسرے معیار کے تحت کسی حد تک یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: معاویہ ایک ایسے انسان تھے جو صرف اپنی فکر میں رہتے تھے' اور فقط اپنے لئے سوچتے تھے' وہ اپنی جاہ طلبی کی تسکین کے لئے دوسرے انسانوں کا استحصال کرتے تھے۔ پس ان میں خودغرضی' خود پسندی اور خود پرستی پائی جاتی تھی۔ لیکن ان کے برعکس ابوذر باوجود یہ کہ ان کے لئے تمام امکانات فراہم تھے اور یہی معاویہ تیار تھے کہ ان کے لئے زندگی کا بہترین ساز و سامان فراہم کریں' لیکن صرف اس لئے کہ معاویہ نے عوام کے حقوق کو پامال کیا تھا اور اس لئے کہ وہ (ابوذر) دوسروں کے مسائل کی فکر کیا کرتے تھے' لہٰذا انہوں نے معاویہ کی مخالفت کی' یہاں تک کہ انہوں نے اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی اور جلاوطنی کے مقام ربذہ میں تنہائی اور غریب الوطنی کے عالم میں جان دے دی۔ پس یہ جو ہم ایک انسان ہونے کے اعتبار سے ابوذر کو معاویہ پر ترجیح دیتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ معاویہ کو صرف اپنی فکر تھی اور ابوذر دوسرے انسانوں کے لئے سوچتے تھے۔

ہم کیوں علی علیہ السلام کو ایک انسان کامل سمجھتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ معاشرے کے دکھ درد کو محسوس کرتے تھے' اس لئے کہ ان کی 'میں' 'ہم' میں تبدیل ہو چکی تھی' اس لئے کہ ان کی "خود" ایسی خود تھی جو تمام انسانوں کو جذب کر لیتی تھی۔ وہ دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ ایک فرد نہیں تھے' بلکہ واقعاً وہ اپنے آپ کو ایک بدن کا ایک عضو' ایک انگشت' ایک عصب محسوس کرتے تھے کہ جب بدن کے کسی ایک مقام پر کوئی تکلیف ہوتی ہے' تو وہ عضو بھی بے چین و بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور یہ خود انہی کے الفاظ ہیں:

بیسویں صدی میں ہیومن ازم (Humanism) کے فلسفوں کے یہ کہنے سے پہلے ہی حضرت علی علیہ السلام نے یہ الفاظ کہہ دیئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے اہلکار (ان کی جانب سے تعینات کئے گئے گورنر) نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی ہے' تو آپ نے اسے ایک عتاب آمیز خط لکھا' یہ خط نہج البلاغہ میں موجود ہے۔

اب وہ دعوت کیسی تھی؟

کیا اُس گورنر نے کسی ایسی دعوت میں شرکت کی تھی جس کے دسترخوان پر شراب موجود تھی؟ نہیں۔

کیا وہاں جوا کھیلا جا رہا تھا؟ نہیں۔

کیا وہاں مثلاً عورتوں کو لا کر رقص کروایا گیا تھا؟ نہیں۔

کیا وہاں کوئی اور حرام کام انجام دیا گیا تھا؟ نہیں۔

پس پھر کیوں اس دعوت کی مذمت کی جا رہی ہے اور اتنا سخت خط لکھا جا رہا ہے؟

فرماتے ہیں: وَ مَا ظَنَنْتُ اَنَّکَ تُجِیْبُ اِلٰی طَعَامِ قَوْمٍ عَائِلُهُمْ مَجْفُوٌّ وَ غَنِیُّهُمْ مَدْعُوٌّ (۱) ان کے گورنر کا قصور یہ تھا کہ اُس نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی تھی جہاں صرف بڑے لوگ مدعو تھے' یعنی مالدار لوگ وہاں موجود تھے اور غریب محروم۔ حضرت علی فرماتے ہیں: مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا گورنر' میرا نمائندہ ایک ایسی محفل میں قدم رکھے گا جس کے شرکا صرف امراء ہوں گے۔ اس کے بعد ان گورنر کو اپنے اور اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں' اپنے بارے میں کہتے ہیں۔ آپ اپنے درد سے زیادہ دوسروں کا درد محسوس کرتے ہیں' اُن کا دکھ درد اس بات کا سبب بنا کہ انہیں اپنا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔ امام علی کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ آپ حقیقتاً عالم' دانشور اور حکیم تھے۔

۱۔ مجھے یہ امید نہ تھی کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت قبول کر لوگے جن کے یہاں سے فقیر اور نادار لوگوں کو دھتکار دیا گیا ہو۔ (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۵)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہم جو حضرت علی علیہ السلام کی اس قدر تعریفیں کرتے ہیں' اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ آپ علم پیغمبر کا دروازہ تھے' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا. (١) بلکہ ہم زیادہ تر اس لئے ان کی تعریف کرتے ہیں کہ آپ انسان تھے۔ انسانیت کا یہ رکن آپ میں موجود تھا کہ آپ محروم انسانوں کے بارے میں سوچتے تھے' غافل نہیں تھے' دوسروں کا دکھ درد محسوس کرتے تھے۔ اسی طرح آپ میں انسانیت کے دوسرے ارکان بھی پائے جاتے تھے۔

٣: ارادہ

ایک دوسرا مکتب کہتا ہے کہ: معیار انسانیت "ارادہ" ہے' وہ ارادہ جو انسان کو خود اپنے نفس پر مسلط کردے۔ بالفاظ دیگر انسان کا خود اپنے اوپر' اپنے نفس پر' اپنے اعصاب پر' اپنی جبلتوں پر اور اپنی نفسانی خواہشات پر تسلط معیار انسانیت ہے۔ یہاں تک کہ انسان سے جو عمل بھی صادر ہو وہ اس کی عقل اور ارادے کے حکم سے ہو' اسکی رغبت اور رجحان کے حکم سے نہیں۔

رغبت و رجحان اور ارادے کے درمیان فرق ہے۔ انسان میں پائی جانے والی رغبت اور اس کا رجحان ایک کشش اور جاذبہ ہوتا ہے' یہ بیرونی پہلو رکھتا ہے' یعنی انسان اور اُس خارجی شے کے درمیان ایک رابطہ ہے جو انسان کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ ایک ایسے بھوکے آدمی کی طرح جو کھانے کی جانب رغبت رکھتا ہے' یہ رغبت ایک کشش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یا مثلاً جنسی خواہش ایک کشش ہے' ایک رغبت ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں تک کہ نیند بھی اسی طرح ہے۔ نیند انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے' انسان اُس حالت کی جانب کھنچتا چلا جاتا ہے جسے "نیند" کہتے ہیں۔ جاہ و مقام کی جانب رغبت' عہدے و منصب کی خواہش اور اسی طرح کی دوسری چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

لیکن ارادے کا تعلق زیادہ تر اندر سے ہے' رغبت و رجحان کے برعکس ہے' {ارادہ} انسان کو رغبتوں اور خواہشات کی کشش سے آزاد کرتا ہے۔ یعنی خواہشات کو انسان کے کنٹرول میں دے

١۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ (غایۃ المرام۔ باب ٢٩)

http://fb.com/ranajabirabbas

دیتا ہے۔ جیسا ارادہ کرتا ہے ویسا کام کرتا ہے' نہ کہ جیسی خواہش ہو ویسا کام۔

ارادے اور فکر کے تابع ہونے اور رغبت و رجحان کے تابع ہونے کے درمیان فرق ہے۔ یہ خواہشات پر کنٹرول کی ایک قسم ہے۔ اگر آپ نے غور کیا ہو تو علمائے اخلاق' ہمارے اخلاق کے قدیم اساتذہ کا زیادہ تر زور ارادے پر ہی ہوتا تھا' ایسا ارادہ جو انسانی رغبتوں اور خواہشات پر حاکم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ انسانیت کا معیار و میزان ارادہ ہے۔ حیوان' جبلتوں کے جبر کا تابع موجود ہے' جو خواہشات ہی ہوتی ہیں۔ لیکن انسان وہ موجود ہے جو ارادے اور اختیار کے حکم کے تحت جبلت کے جبر سے آزاد ہو۔ انسان یہ ارادہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنی رغبت کے خلاف عمل کرے گا۔ پس انسان وہ ہے جو اپنے آپ پر مسلط ہو اور جتنا انسان اپنے آپ پر مسلط نہ ہو' اتنا ہی وہ انسانیت سے دور ہے۔

اسلام میں نفس امارہ پر تسلط کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس بارے میں ایک چھوٹا سا قصہ (جسے شاید آپ نے سن رکھا ہو) نقل کرتے ہیں:

لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں ایک مقام سے گزر رہے تھے جہاں جوانوں کا ایک گروہ ایک بڑے پتھر کو اُٹھانے کے ذریعے زور آزمائی میں مشغول تھا (جیسے ویٹ لفٹنگ کرتے ہیں) تاکہ دیکھیں کہ اُن میں سے کون بہتر طریقے سے اسے اُٹھا سکتا ہے۔ اسکے لئے بھی دوسرے مقابلوں کی طرح ایک جج کی ضرورت تھی' کیونکہ کبھی دو افراد وزن کو قریب قریب یکساں بلندی تک اٹھا لیتے تھے۔ جب پیغمبر اس مقام سے گزرے' تو جوانوں نے کہا کہ پیغمبر سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ {انہوں نے کہا} اے اللہ کے رسول! آپ یہاں ٹھہر کر ہمارے درمیان فیصلہ کریں کہ ہم میں سے کون بہتر انداز سے وزن اُٹھاتا ہے۔ آنحضرت نے اُن کی فرمائش قبول کرلی۔ وہ وزن اُٹھانے لگے۔ آخرکار پیغمبر نے فرمایا: کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے زیادہ طاقتور اور زیادہ قوی کون ہے؟ ان لوگوں نے کہا: جی رسول اللہ! آپ نے فرمایا: سب سے زیادہ طاقتور اور زیادہ قوت والا شخص وہ ہے کہ جب وہ غصے میں آئے' تو اس کا غصہ اس پر غالب نہ آئے' بلکہ وہ اپنے غصے پر غالب ہو اور اس کا غصہ اسے وہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

راستہ اختیار نہ کرائے جس میں خدا کی رضا نہ ہو' وہ اپنے غصے پر مسلط ہو۔ اور اگر وہ کسی بات پر خوش ہو تو اس کا یہ خوش ہونا اسے رضائے الٰہی کے خلاف کسی طرف نہ لے جائے اور وہ اپنی رضا' اپنی رغبت اور اپنی خواہش پر مسلط ہو۔ یعنی پیغمبر نے اس جسمانی زور آزمائی کو فوراً ایک روحانی مقابلے میں تحلیل اور تبدیل کر دیا اور قوتِ بازو کے مسئلے کو قوتِ ارادہ کی حیثیت سے تحلیل کیا۔ فرمایا کہ ہاں یہ بھی ایک کام ہے' وہ شخص جس کے بازو زیادہ قوی ہوں اس میں زیادہ مردانگی ہے' لیکن مردانگی صرف قوتِ بازو سے نہیں ہوتی' قوتِ بازو اسکی ایک چھوٹی سی علامت ہے۔ مردانگی کی بنیاد ارادے کی قوت سے ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

وقت خشم و وقت شہوت مرد کو   طالب مردی چنینم کو بکو (۱)

ہم' جو علی علیہ السلام کو شیرِ خدا کہتے ہیں' مردِ خدا کہتے ہیں' اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ دو محاذوں پر ہر ایک سے زیادہ مرد تھے' ایک بیرونی اور اجتماعی محاذ پر' مبارزے کے میدانوں میں' جہاں آپ ہر پہلوان کو چت کر دیتے تھے' اور اس سے بھی زیادہ اہم خود اپنے اندر کے محاذ پر کہ آپ خود اپنے اوپر مسلط تھے' ان کا ارادہ ہر ذاتی رجحان' ہر نفسانی خواہش' ہر ایک سوچ پر حاکم تھا۔

یہ داستان جسے مولانا روم نے اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے' مردانگی اور قوتِ ارادہ کے اعتبار سے کس قدر غیر معمولی ہے' کیسی عالی اور لطیف مثال ہے' جس میں ایک چوبیں پچیس سالہ جوان' اپنے انتہائی طاقتور دشمن کو پچھاڑ کر اسکے سینے پر بیٹھ جاتا ہے' اور جوں ہی اس کا سر تن سے جدا کرنا چاہتا ہے' وہ علی کے رخِ مبارک پر تھوک دیتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ علی طیش میں آجاتے ہیں' اس کا سر کاٹنے سے عارضی طور پر ہاتھ روک لیتے ہیں' چند لحظ ٹہلتے ہیں اور اسکے بعد پلٹتے ہیں۔ دشمن پوچھتا ہے: آپ کیوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ فرماتے ہیں: اس لئے کہ اگر اس حال میں' میں تیرا سر کاٹ لیتا' تو ایسا اپنے غصے کے زیر اثر کرتا' اپنے فریضے کی ادائیگی کی خاطر' اپنے مقصد اور خدا کی راہ میں نہیں۔

۱۔ غصے اور نفسانی خواہش کے موقع پر جو مردانگی دکھاتا ہے' میں گلی گلی کوچے کوچے ایسے مرد کا متلاشی ہوں۔

http://fb.com/ranajabirabbas

انسان کو اپنے آپ پر' اپنے اعصاب پر' اپنے غصے پر اور اپنی مرضی پر مسلط ہونا چاہئے۔

یہ بھی انسانیت کے لئے ایک معیار اور ایک نظریہ ہے۔ ایک دو معیار اور آپ کی خدمت میں عرض کر کے اپنی عرائض ختم کریں گے۔

۴: آزادی

انسان کی انسانیت کے لئے ایک اور معیار آزادی ہے۔

اس سے کیا مراد ہے؟

مراد یہ ہے کہ انسان اس قدر انسان ہے جس قدر وہ کوئی جبر قبول نہ کرے' کسی طاقت کا محکوم اور اسیر نہ ہو' خود آزادی کے ساتھ ہر چیز کا انتخاب کرے۔

آپ جانتے ہیں کہ جدید مکاتیب میں انسانیت کے معیارات میں سے ایک معیار کے طور پر آزادی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یعنی جس قدر انسان آزاد زندگی گزار سکے' اسی قدر وہ انسان ہے۔ پس آزادی معیارِ انسانیت ہے۔

اس نظریے کے متعلق کیا خیال ہے؟

یہ نظریہ درست ہے یا نہیں؟

یہ نظریہ بھی گزشتہ نظریات ہی کی طرح' درست بھی ہے اور غلط بھی۔ یعنی انسان کی انسانیت کے ایک جز کے طور پر درست ہے' لیکن انسانیت کا پورا معیار ہی یہ ہو' تو اس لحاظ سے یہ درست نہیں ہے۔

اسلام میں' جس طرح انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی ترغیب دی گئی ہے' اسے مقدس قرار دیا گیا ہے اور اس کی دعوت دی گئی ہے اور جس طرح انسان کے اپنے نفس پر تسلط کو مقدس سمجھا گیا ہے اور اس کی دعوت دی گئی ہے' اسی طرح آزادی کو بھی مقدس سمجھا گیا ہے۔

اسلام عجیب ہے! اس نے ان تمام چیزوں پر گفتگو کی ہے۔ نہج البلاغہ میں' اس وصیت نامے میں' جو حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام کے نام تحریر کیا ہے' آیا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabirabbas@yahoo.com

کہ: اَکْرِمْ نَفْسَکَ عَنْ کُلِّ دَنِیَّةٍ اپنے آپ کو اپنے نفس کو ہر پست کام سے برتر سمجھو۔ پست اعمال کو قبول نہ کرو کہ تمہاری روح پست کاموں سے بالاتر ہے۔ فَاِنَّکَ لَنْ تَعْتَاضَ بِمَا تَبْذُلُ مِنْ نَفْسِکَ عِوَضاً نفسانی خواہش کی خاطر اپنی روح سے جو قیمت تم ادا کرتے ہو اُس کے مقابلے میں تمہیں کچھ بھی نہیں ملتا۔ ایک شوق ایک نفسانی خواہش کی خاطر جو قیمت تم اپنی بزرگی اپنی روح سے ادا کرتے ہو اس کا کوئی عوض نہیں۔ یہاں تک کہ فرماتے ہیں: وَ لَا تَکُنْ عَبْدَ غَیْرِکَ وَ قَدْ جَعَلَکَ اللّٰهُ حُرّاً۔ (۱) کسی صورت اپنے آپ کو کسی کا غلام نہ بناؤ کہ خدا نے تمہیں آزاد خلق کیا ہے۔

آپ یہ نہیں کہتے کہ خدا نے صرف تم کو تم جو میرے بیٹے ہو اور امام حسن ہو تمہیں خدا نے آزاد خلق کیا ہے بلکہ یہاں "تم" ایک انسان کے طور پر فرما رہے ہیں کیونکہ یہ تخلیق کا مسئلہ ہے۔ یہ بھی (کہ معیار انسانیت آزادی ہے) ایک نظریہ ہے جیسا کہ مکتب وجودیت (existentialism) میں معیار انسانیت کے معاملے میں زیادہ تر آزادی کے مسئلے پر زور دیا گیا ہے۔

۵: فریضہ اور ذمے داری

انسانیت کا ایک اور معیار فریضہ اور ذمے داری ہے۔ البتہ یہ زیادہ تر "کانٹ" سے شروع ہوا ہے اس کے بعد ہمارے زمانے میں اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان وہ ہے جو ذمے داری کا احساس رکھتا ہو دوسرے انسانوں کے مقابل احساس ذمے داری کا حامل ہو (غلط فہمی نہ ہو جائے یہ محبت کے علاوہ ہے) اپنے سماج کے حق خود اپنے اور اپنے گھرانے کے حوالے سے ذمے داری کا احساس رکھتا ہو۔

ذمے داری کے مسئلے نے ہمارے زمانے میں بہت وسعت اختیار کر لی ہے اس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن یہاں بحث یہ ہے کہ ذمے داری کی بنیاد کیا ہے؟ آزادی بھی اسی طرح ہے۔ کہاں سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ انسان کو کس طرح احساس ذمے داری حاصل کرنا

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چاہئے؟ یعنی کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان احساس ذمے داری کرے اس احساس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا صرف بول دینے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کے یہ کہہ دینے سے کہ میں ذمے دار ہوں اس کے ضمیر میں ذمے داری پیدا ہو جائے گی؟ اس ذمے دار ضمیر کو کونسی طاقت بناتی ہے؟ یہ خود ایک نکتہ ہے۔

۶: زیبائی

ہم ایک اور مکتب کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ مکتب زیبائی پر زور دیتا ہے۔ افلاطون نے اخلاق کی صفت زیبائی اور خوشنمائی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ چیز انسانی ہے جو زیبا اور خوشنما ہو۔ مثلاً عدالت کو تمام مکاتیب پسند کرتے ہیں۔ ایک مکتب عدالت کو محبت کی بنیاد پر پسند کرتا ہے دوسرا مکتب عدالت کو اسکے اخلاقی میزان کی بنیاد پر پسند کرتا ہے ایک اور مکتب کیونکہ عدالت اور آزادی کے درمیان قرابت کا قائل ہے اس لئے اسے پسند کرتا ہے۔ ایک اور ممکن ہے عدالت کو ذمے داری کے پیمانے پر پرکھتا ہو۔ افلاطون عدالت کو خوش نمائی کی عینک سے دیکھتا ہے کہتا ہے: عدالت جو ایک اچھی چیز ہے (خواہ ایک فرد میں پائی جانے والی اخلاقی عدالت ہو خواہ معاشرے میں پائی جانے والی اجتماعی عدالت) تو یہ اس وجہ سے اچھی ہے کہ یہ توازن کی بنیاد ہوتی ہے اور زیبائی و خوش نمائی پیدا کرتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں عدالت ہو وہ خوش نما اور خوب صورت ہوتا ہے اور یہ انسان میں پائی جانے والی خوب صورت پسندی کی حس ہے جس نے اسے عدالت پسند بنایا ہے۔ انسان اگر انسان بننا چاہے انسانی خصلتوں تک پہنچنا چاہے تو اسے اپنے اندر حسِ زیبائی کو تقویت پہنچانی چاہئے اس کی جز زیبائی ہے۔ البتہ افلاطون اس جانب متوجہ تھا کہ معنوی زیبائیاں انسانی زیبائیاں ہیں۔ یہ بھی ایک مکتب ہے۔

آئندہ نشست میں (۱) ہم ان مکاتیب کے بارے میں کچھ اظہار خیال کریں گے تاکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے معیار انسانیت کونسا ہے؟ وہ حیاتیاتی بات جسے ہم نے

۱۔ یہ نشست شاید منعقد نہیں ہوئی یا اگر منعقد ہوئی تو اس کی [illegible]

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

دیکھا کہ درست نہیں ہے۔ حیاتیات کے معیار کے مطابق انسانیت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ دیکھیں گے کہ فلسفی' اخلاقی اور مذہبی معیارات کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے اور اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

وَ صَلَّی اللّٰهُ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ الطَّاهِرِیْنَ.

☆......☆......☆

مکتبِ انسانیت ☆

موضوعِ گفتگو مکتبِ انسانیت ہے۔ انسان ہماری اس معلوم دنیا کا وہ واحد وجود ہے جو جستجو اور تحقیق کرتا ہے' وہ خود ہمیشہ اپنا موضوعِ بحث اور عنوانِ تحقیق رہا ہے۔ یعنی وہ مسائل جن پر انسان ہمیشہ بحث و گفتگو کرتا رہا ہے' اُن میں سے ایک مسئلہ وہ خود رہا ہے۔

لفظ ''انسانیت'' کا مفہوم ہمیشہ ایک قسم کے تقدس اور عظمت کا حامل رہا ہے' اسی طرح انسان کے وہ امتیازات جو حیوان سے برتر ہیں' جیسے علم' عدالت' آزادی اور اخلاق کو بھی مقدسات کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ پس انسان اور انسانیت کو عام طور پر ایک مقدس امر شمار کیا گیا اور کیا جاتا ہے۔ یعنی متعدد انسانی مقدسات میں شک و شبہ کیا گیا ہے اور حتیٰ بعض کا انکار بھی کیا گیا ہے' اسکے باوجود بظاہر اب تک دنیا میں کوئی ایسا مکتب (school of thought) پیدا نہیں ہوا ہے جو عملی طور پر انسانیت کے خاص امور کو' انسان کے حیوانیت سے بلندتر پہلوؤں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے اور ان کو مقدس شمار نہ کرے۔ ہمارے اپنے مولانا روم کی ایک مشہور غزل ہے' جس کا ذکر کرنا مناسب ہے:

بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست　　بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست

☆۔ یہ تقریر تہران کے ٹیکنیکل کالج میں کی گئی اس کی تاریخ کا علم نہیں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

یعقوب وار وا اسفاھا ہمی زنم دیدار خوب یوسفِ کنعانم آرزوست

زین ہمرہان ست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رُستمِ دستانم آرزوست

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود گشتہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست(۱)

اور شیخ سعدی نے اپنی "طیبات" (سعدی کی عرفانی غزلیں) میں ان کی تائید یا ان کا جواب دینے کے لئے کہا ہے:

از جان برون نیامدہ جانانت آرزوست زُنار نابریدہ و ایمانت آرزوست

بر دیدہ ای و ہمت مردی نکردہ ای وآنگاہ حق سفرۂ مردانت آرزوست

فرعون وار لاف انا الحق ہمی زنی آنگاہ قُربِ موسیٰ عمرانت آرزوست(۲)

بہرحال انسانی ادبیات کا ایک اہم حصہ (خواہ وہ دینی ادب ہو یا غیر دینی ادب) انسانیت اور اس کے احترام کے مسئلے پر مشتمل ہے۔ بطورِ خاص جس اسلامی ادب سے ہم واقفیت رکھتے ہیں (خواہ وہ عربی میں ہو یا فارسی میں) اس میں اس حوالے سے بہت سی باتیں موجود ہیں۔

حالیہ صدیوں میں انسانیت کا زوال

حالیہ صدیوں میں سائنس کی عظیم ترقی کے ساتھ یکلخت انسانیت اپنے اُس مقامِ تقدس

۱۔ اپنا چہرہ دکھا دے کہ میری آرزو باغ و گلستاں ہے۔ اپنے لب کھول دے کہ میری آرزو شیرینی کا حصول ہے۔ میں یعقوب کی طرح وا اسفا کے نعرے لگا تا رہوں گا کہ یوسفِ کنعان کا دیدار میری آرزو ہے۔ میں ست اور بے حال ساتھیوں کی وجہ سے بہت دل گرفتہ ہوں۔ مجھے شیرِ خدا اور رستم جیسے افراد کی آرزو ہے۔ کل رات شیخ چراغ لے کر پورا شہر ڈھونڈ رہے تھے کہ میں دیو اور بھوت سے بیزار اور انسان کا آرزومند ہوں۔ میں نے کہا کہ ہم نے اتنا ڈھونڈا لیکن نہ ملا' کہنے لگے کہ جو نہیں مل رہا وہی میری آرزو ہے۔

۲۔ جان سے ہاتھ دھوئے بغیر جاناں کی آرزو کرتے ہو؟ مجوسیت چھوڑے بغیر ایمان کی آرزو کرتے ہو؟ تم نے مرد دیکھے تو ہیں لیکن کبھی مردانگی دکھائی نہیں ہے۔ پھر تم مردوں کے دسترخوان کی آرزو کرتے ہو۔ فرعون کی طرح انا الحق کا نعرہ لگا [illegible] قُرب کی تمنا کرتے ہو؟

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے گر گئی جس کا قدیم انسان (اس کے بارے میں) قائل تھا۔ ایسی گری کہ کرچی کرچی ہو گئی۔ کیونکہ جو چیز جتنی بلندی پر ہو گی' جب گرے گی تو یہ گرنا اسے اتنا ہی ریزہ ریزہ کر دینے والا ہو گا۔ انسان بالکل نیم خدائی کے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ ہماری ادبیات میں انسان کے اس نیم خدائی مقام کا کس قدر ذکر کیا گیا ہے:

طائرِ گلشن قدسم چہ دہم شرحِ فراق
کہ در این دامگہ حادثہ چون افتادم(۱)

اور حافظ کہتے ہیں:

تورا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ در این دامگہ چہ افتادہ است(۲)

گزشتہ دو تین صدیوں میں انسان اپنے اس عظیم اور بلند مقام سے' جسے اس نے اپنے لئے فرض کیا ہوا تھا' یکایک گر گیا۔ ایسا گرنا جو کرچی کرچی کر دیتا ہے۔ انسان نے جو اوّلین انکشافات کئے (اُن میں سے ایک) ہیئتِ عالم کے حوالے سے تھا۔ جو کچھ زمین کے بارے میں پہلے اس کا تصور تھا' جس کے تحت وہ زمین کو کائنات کا مرکز سمجھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ افلاک اور ستارے زمین کے گرد گردش کرتے ہیں' یہ تصور اچانک بدل گیا اور اب زمین ایک چھوٹا سا ستارہ بن گئی جسے سورج کے گرد گھومنا ہے' اور پھر خود سورج کو بھی ستاروں کی دنیا میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں رہی۔

اس موقع پر یہ نظریہ شدید شکوک و شبہات اور انکار کا نشانہ بنا کہ انسان دائرۂ امکان کا مرکز اور تخلیقِ کائنات کا ہدف ہے۔ اب کسی میں یہ باتیں کرنے کی جرأت نہیں تھی کہ: اے مرکزِ دائرۂ امکان' اے زبدۂ عالمِ کون و مکان! تو جوہرِ ناسوت کا بادشاہ ہے' تو مظاہرِ لاہوت کا خورشیدِ پُرنور ہے۔ اب کہا جانے لگا کہ: نہیں' ہم جیسا انسان کے بارے میں سمجھتے تھے' وہ ایسا نہیں ہے۔ انسان

۱۔ میں گلشنِ قدسی کا پرندہ ہوں' فراق کی داستان کیسے بیان کروں کہ میں اس دامِ حوادث (دنیا) میں گھر گیا ہوں۔

۲۔ تجھے تو عرشِ الٰہی سے پکارا جا رہا ہے' مجھے نہیں معلوم کہ تو اس جال میں کیوں الجھ گیا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس علمی چوٹ کے نتیجے میں کائنات میں اپنی مرکزیت کے اس تصور سے' جسے اس نے ستاروں اور افلاک کے لئے زمین کی مرکزیت کے ساتھ نتھی کر دیا تھا' محروم ہو گیا۔

اس کے بعد انسانی پیکر پر مزید انتہائی پارہ پارہ کر دینے والی ضربیں بھی لگیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ انسان اپنے آپ کو ایک تقریباً آسمانی مخلوق سمجھتا تھا' خلیفۃ اللہ سمجھتا تھا' نفخۂ الٰہی سمجھتا تھا اور اس کا اعتقاد یہ تھا کہ اس کے پیکر میں روح خدا پھونکی گئی ہے جس سے وہ وجود میں آیا ہے۔

انواع میں تبدیلی اور ارتقا کے مسئلے پر حیاتیاتی تحقیقات نے ایک انسان کا سلسلۂ نسب ان حیوانات کے ساتھ ملا دیا جنہیں انسان بہت پست اور حقیر سمجھتا تھا۔ اس نے کہا: اے انسان! تو بندر کی نسل سے ہے' یا فرض کر کہ بندر کی نسل سے نہیں ہے تو دوسرے جانوروں کی طرح کسی اور حیوان کی نسل سے ہے۔ مختصر یہ کہ تیری اور حیوانات کی نسل یکساں ہے۔ اس طرح انسان سے خدائی مولود کا پہلو چھین لیا گیا۔ یہ انسان کے پیکر اور انسان کے تقدس پر پڑنے والی دوسری کاری ضرب تھی۔

انھی انتہائی موثر ضربوں میں سے ایک اور انتہائی موثر ضرب وہ تھی جو انسان کے بظاہر درخشاں ماضی' اس کے نامۂ عمل اور اس کے افعال پر پڑی۔ یعنی انسان اپنی سرگرمیوں کے ذریعے اس بات کا اظہار کرتا تھا کہ وہ ایسے پاک اور خدائی کام انجام دے سکتا ہے' جن میں عشق الٰہی کے سوا کوئی اور محرک نہ ہو' احسان اور نیکی کے سوا ان کا کوئی اور سبب نہ ہو' وہ کوئی حیوانی اور عامیانہ پہلو نہیں رکھتے۔ اچانک ایسے تصورات سامنے آئے اور ان میں یہ ظاہر کیا جانے لگا کہ نہیں' انسان نے اپنے لئے جس انتہائی مقدس اور پاک و پاکیزہ نامۂ عمل کو تیار کیا ہے' وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ تمام سرگرمیاں جنہیں انسان نے علم دوستی اور علم طلبی کا نام دیا ہے' آرٹ اور حُسن کا نام دیا ہے' اخلاق اور ضمیر کا نام دیا ہے' تسبیح و تقدیس و تعالی کا نام دیا ہے اور انہیں ماورائے طبیعت حیثیت دے رکھی ہے' یہ سب اسی قسم کی سرگرمیاں ہیں جو حیوانات سے بھی ظاہر ہوتی ہیں' لیکن انسان میں اس کی شکل اور اس کا میکانزم نسبتاً پیچیدہ ہے۔ ایک نے کہا کہ: ان سب کا سرچشمہ پیٹ ہے۔ ہمارے سعدی نے بھی کہا ہے: "مایۂ عیش آدمی شکم است" دوسروں نے اس سے بڑھ کر کہا کہ: نہیں نہ

http://fb.com/ranajabirabbas

صرف انسان کا مایۂ عیش پیٹ ہے بلکہ انسان کا مایۂ فکر بھی پیٹ ہے' انسان کا مایۂ دل بھی پیٹ ہے۔ اور کچھ لوگوں نے تو انسان کے لئے اس مقام کو بھی بہت بڑا اور اونچا سمجھا۔ لہٰذا وہ کچھ نیچے آ گئے اور بولے: پیٹ سے بھی کچھ نیچے۔

پس شاندار ماضی اور قابل تقدیس و تمجید سرگرمیوں کے اعتبار سے' ان ضربوں کے نتیجے میں انسان کی حیثیت خراب ہوئی اور ختم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ صورتحال یہ ہو گئی کہ کہا جانے لگا کہ: آیئے ذرا نئے سرے سے اس مخلوق کا جائزہ لیتے ہیں' یہ مخلوق جو ایک دن اپنے آپ کو دنیا کا مرکز اور کائنات اور خلقت کو اپنا طفیلی سمجھتی تھی اور خود کو روح الٰہی کا ایک نمونہ سمجھا کرتی تھی' یہ مخلوق جو کبھی اپنے افعال کو غیر معمولی تقدس کا حامل بھی سمجھتی تھی' اپنے بارے میں حیوانی پہلوؤں سے بڑھ کر کی قائل تھی' بنیادی طور پر ہے کیا؟ اس کا پیکر کس چیز سے بنا ہے؟

پھر ایک ایسا مفروضہ سامنے آیا جس کے مطابق اتنے دعوے کرنے والی اس مخلوق اور نباتات حتیٰ جمادات کے درمیان بھی تار و پود کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ہماری بناوٹ اور ہماری شکل اور نظم کے اعتبار سے فرق ضرور ہے' لیکن تار و پود کے اعتبار سے اور اس مادے کے اعتبار سے جو اسے وجود میں لایا ہے' کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل کھدر اور فاستونی (۱) کپڑے کی طرح' جو دونوں ہی بنائے تو سوت ہی سے جاتے ہیں لیکن کھدر سخت دھاگے اور موٹی بُنائی سے بنایا جاتا ہے' جبکہ فاستونی کپڑا نرم دھاگے اور باریک بُنائی کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔

جی ہاں' انسان اور نباتات یا جماد کے درمیان ظرافت' بناوٹ اور دوسری بہت سی چیزوں میں فرق ضرور ہے لیکن اُس مادّے میں جو انہیں وجود میں لایا ہے' کوئی فرق نہیں ہے۔ اب روح اور نفخۂ الٰہی کا وجود ختم ہو کے رہ گیا۔ انسان دوسری مشینوں کی طرح ایک مشین ہے' یعنی مختلف قسم کی مشینوں میں سے ایک مشین ہے۔ البتہ ایک مشین دوسری مشین سے مختلف ہوتی ہے۔ جو گھڑی آپ کے ہاتھ اور میری جیب میں ہے' یہ بھی ایک مشین ہے اور سائیکل بھی ایک مشین ہے' گاڑی

۱۔ فاستونی روسی زبان کا لفظ ہے جو ایران میں اونی یا دھاگے سے بنے کپڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی ایک مشین ہے' اپولو بھی' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تیس یا پچاس لاکھ پرزے استعمال ہوتے ہیں' وہ بھی ایک مشین ہے' البتہ نسبتاً بہت ہی زیادہ پیچیدہ اور بڑی مشین۔ لیکن اس حوالے سے اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ یہ بھی دوسری مشینوں کی طرح ایک مشین ہے اور مشینی حیثیت کے علاوہ اس کی کوئی اور حیثیت نہیں ہے۔

یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ انسانیت کے پیکر پر پڑنے والی آخری ضرب تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی انسانی اقدار سو فیصدی ختم نہیں ہوئیں' سوائے بعض فلسفوں اور فلسفی نظاموں کے اندر جنہوں نے صلح' آزادی' معنویت' عدالت اور رحمدلی جیسے مفاہیم کا مذاق اڑایا۔

انسانیت کا دوبارہ ظہور اور پیدا ہونے والا تناقض

انیسویں صدی کے وسط سے ہمارے اس زمانے تک' ہم بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہیں' انسانیت دوبارہ ظہور کر رہی ہے' خود ایک بنیادی مقام حاصل کر رہی ہے' ایک بار پھر دنیا میں انسانی مکاتیب کے نام سے' حتیٰ انسان پرستی کی صورت میں مکاتیب پیدا ہو رہے ہیں۔ ماضی میں انسان معبود نہیں تھا' ایک بڑی آیت تھا' معنویت کا ایک بہت بڑا دریچہ تھا۔ بے شک قرآن بھی معنویت کے لئے' خدا اور ماورائے طبیعت چیزوں کی معرفت کے لئے' انسان کو کسی بھی دوسری آیت' کسی بھی دوسرے دروازے اور کسی بھی دوسرے دریچے سے زیادہ مناسب سمجھتا ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ. (۱) {قرآن مجید نے} آفاق کا ذکر علیحدہ کیا ہے اور انفس کا ذکر علیحدہ اور یہیں سے عارفوں' ادیبوں اور شاعروں کے درمیان "آفاق" اور "انفس" کی اصطلاح وجود میں آئی ہے۔ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲) غیب اور ملکوت کے مشاہدے کے لئے زمین میں نشانیاں' ذرائع' دروازے

۱۔ ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے نفس کے اندر دکھلائیں گے۔ (سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۵۳)

۲۔ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی' کیا تم دیکھتے نہیں (سورۂ ذاریات ۵۱۔ آیت ۲۰'۲۱)

http://fb.com/ranajabirabbas

اور دریچے موجود ہیں اور خود تمہارے وجود میں بالخصوص ("تمہارے وجود" کا ذکر علیحدہ سے کرتا ہے) "اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یعنی بصیرت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ غور کیوں نہیں کرتے؟ اپنے اندر غور کرو اور دیکھو۔

یہی موجود جو ماضی میں ایک عظیم آیت اور انسان کے اپنے آپ سے گزر کر الٰہی معنویت اور غیب اور ملکوت پر ایمان کی جانب جانے کا دروازہ تھا' ایک مرتبہ پھر موضوع بنا ہے۔ لیکن اس مرتبہ ایک دوسری شکل میں موضوع بنا ہے' ایک ایسی شکل میں کہ محسوس ہوتا ہے اپنے آپ کو تضادات اور تناقضات سے نجات نہیں دے سکا ہے اور اصل مشکل اور اہم مسئلہ یہی ہے۔

یعنی انسانیت نئے سرے سے اپنی قداست' عظمت اور عزت کا حصول چاہتی ہے اور وہ بھی اس طرح سے کہ وہ ہدف اور مقصد بن جائے' تمام سرگرمیوں کی غرض وغایت بن جائے لیکن گزشتہ معیارات کو درمیان میں لائے بغیر' اُسے خدائی اور نا خدائی پہلو دیے بغیر' مسئلہ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۱) کو درمیان میں لائے بغیر' بنا سکے کہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ. (۲) کا مسئلہ درمیان میں آئے بغیر' اسکے کہ خدا نے اپنی روح' یعنی ایک ایسی چیز جس کا تعلق اس دنیا سے نہیں' بلکہ وہ دوسری دنیا سے متعلق ہے' اس میں پھونکی ہے۔ یعنی وہ الوہیت کا ایک مظہر ہے' نہیں' اب پھر یہ باتیں درمیان میں نہ آئیں' حتیٰ انسانی محرکات کے دوسرے پہلوؤں' اندرونی محرکات اور انسان کے محرک کے بارے میں بھی بات نہ کی جائے۔ لیکن اس کے باوجود انسان اور انسان کا شعور مقدس اور محترم امور ہوں۔

آج بھی آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بھی مکتب کا ماننے والا ہو' وہ کہتا ہے: میں صلح کا حامی ہوں' آزادی کا طرفدار ہوں' انسان دوست ہوں' عدل وانصاف کا حامی ہوں' حق کا طرفدار ہوں' انسانی حقوق کا طرفدار ہوں۔ حتیٰ انسانی حقوق کے چارٹر کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے: "انسان کی ذاتی حیثیت کا احترام"۔ یعنی چاہتے ہیں کہ انسان کے لئے ایک ذاتی قابل احترام

۱۔ وہ خدا وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی لئے پیدا کیا ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۹)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

۲۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۹' سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۷۲

اور لائق تقدیس حیثیت کے قائل ہو جائیں جس کے بعد تعلیم و تربیت اس بنیاد پر ہو اس طرح سے کہ میں آپ کو ایک قابل احترام اور لائق تقدیس ذاتی حیثیت کا حامل سمجھوں' تا کہ آپ کی ذاتی قداست پر ایمان رکھوں اور آپ کے حقوق پر تجاوز کی طاقت رکھنے کے باوجود اس ایمان کی وجہ سے ایسا نہ کروں' اور آپ بھی میرے وجود میں ایسے ہی ذاتی تقدس پر ایمان رکھیں اور میرے حقوق پر تجاوز کی قدرت رکھنے کے باوجود اس ذاتی تقدس پر آپ کا ایمان اس بات کا باعث بنے کہ آپ میرے حقوق پر' میری آزادی پر تجاوز نہ کریں۔

بہت سے لوگ جو انسان دوستی کے فلسفے کے خواہاں ہیں' وہ گزشتہ معیارات کی بنیاد سے ہٹ کر کوئی فلسفہ چاہتے ہیں۔ اسکے باوجود اسی مقام پر وہ اہم اور بنیادی اعتراض سامنے آتا ہے اور زندگی میں بلکہ آج کے انسان کی فکر اور منطق میں ایک بڑا تناقض وجود میں آتا ہے' ایک ایسی منطق جو کبھی بھی بنیاد حاصل نہیں کر سکتی۔

صلحِ کُل

میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کے محقق لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہوگا جو انسان دوستی کی تشریح اس مفہوم میں کرتا ہوگا کہ جسے "صلحِ کُل" کہا جائے۔ البتہ عام لوگوں میں ایسے افراد ہیں جن کے سامنے جب بشریت اور انسان دوستی کی بات آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ: جناب! سب انسان ہیں' لہٰذا ہماری نظر میں سب کو برابر ہونا چاہئے' ہمیں ایک دوسرے کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہئے۔

ہم کہتے ہیں: انسانی اقدار کے بارے میں کیا خیال ہے؟

تمام انسان' انسانی اقدار کے حامل ہونے کے لحاظ سے تو یکساں نہیں ہیں۔ ایک انسان صاحب علم ہے اور دوسرا بے علم (ممکن ہے آپ کہیں کہ اس کی بے علمی کا سبب یہ تھا کہ علم کا حصول اس کے اختیار ہی میں نہ تھا)' ایک انسان پاک اور پرہیزگار ہے اور دوسرا ناپاک اور بدکردار' ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم' ایک خیر خواہ ہے اور دوسرا بدخواہ۔

کیا ہمیں انسان دوستی کے فلسفے کے تحت یہ کہنا چاہئے کہ یہ سب انسان ہیں اور ہم ان کے

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

درمیان کسی فرق کے قائل نہیں ہیں؟

ہم انسان کو محترم سمجھتے ہیں' اب ہمیں اس سے کیا غرض کہ یہ انسان عالم ہے یا جاہل' باایمان ہے یا بے ایمان' باتقویٰ ہے یا بے تقویٰ' خیر خواہ ہے یا بدخواہ' مصلح ہے یا بدکار و مفسد! ہمیں انسان دوست اور صلحِ کُل ہونا چاہئے۔ اب یہ انسان کسی بھی مسلک یا مکتب سے وابستہ ہو' ہماری نظر میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے!

اگر ہم یہ نظریہ رکھیں' تو ہم نے انسانیت کے ساتھ خیانت کی ہے۔

دور دراز سے ایک مثال پیش کرتا ہوں' ایک دوسرے براعظم سے اور ہمارے اپنے زمانے سے: لومبا ایک انسان تھا' موئی چمبے بھی ایک انسان تھا۔ یعنی علم حیاتیات کے اعتبار سے لومبا اور موئی چمبے کی نسل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ موئی چمبے اور لومبا کے خون کا گروپ مختلف ہو' اگر آپ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور دوسرے کے ساتھ نفرت' تو ایسا اُن کے خون کے گروپ کی وجہ سے نہیں ہے' اس کا سبب کچھ اور ہے۔ لیکن اگر آپ ایک انسان دوست بشر بننا چاہتے ہیں' تو کیا ان دونوں افراد کے بارے میں یکساں طرز فکر رکھ سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں انسان ہیں' اور اب جبکہ یہ دونوں ہی انسان ہیں' تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ میں چمبے کو بھی اسی قدر اچھا سمجھوں جتنا لومبا کو اچھا سمجھتا ہوں اور لومبا کو بھی اسی قدر پسند کروں جتنا چمبے کو پسند کرتا ہوں۔ اور اگر مجھے ان سے نفرت ہونی چاہئے' تو ان دونوں سے یکساں نفرت رکھوں؟ ایسا {سمجھنا درست} نہیں ہے۔

انسان کا حیوان سے بنیادی فرق

انسان کو حیوان پر ایک بنیادی امتیاز حاصل ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان ہر حیوان سے زیادہ "بالقوہ" (Potential) ہے اور کم "بالفعل" ہے۔

{اس سے} کیا مراد ہے؟

مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک گھوڑا' گھوڑا ہے اور بالفعل گھوڑا ہے' یعنی گھوڑا ہونے کے لئے جو

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

چیزیں درکار ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ گھوڑا ہونے میں تھوڑی بہت کمی ہے جو مشلاً اسے مشق کرکے حاصل کرنی ہے۔ گھوڑا، ایک بالفعل گھوڑا ہی اس دنیا میں آتا ہے۔ ایک بلی، بالفعل ایک بلی ہی دنیا میں آتی ہے۔ اور اسی طرح تمام حیوانات ہیں۔ لیکن انسان ہے جو سوفیصد ایک بالقوہ موجود کی صورت دنیا میں آتا ہے۔ یعنی جب وہ پہلی مرتبہ دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو یکسر یہ پتا نہیں ہوتا کہ مستقبل میں وہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے مستقبل میں اُس کی حقیقت ایک بھیڑیے کی حقیقت ہو، ممکن ہے ایک بھیڑ کی حقیقت ہو، لیکن اُس کی شکل ایک انسان کی سی شکل ہو۔ اسی طرح ممکن ہے اس کی حقیقت ایک انسان کی حقیقت ہو۔

ایران سے تعلق رکھنے والے عظیم اسلامی فلسفی صدرالمتألہین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ لوگوں کا یہ سمجھنا کہ تمام افرادِ انسان، سب کے سب ایک ہی نوع سے ہیں، اُن کی غلط فہمی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: انسانوں کی تعداد کے مطابق، اُن کی انواع پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ انسان جنس ہے نوع نہیں ہے۔ البتہ وہ ایک فلسفی ہیں، وہ علم حیاتیات کے اعتبار سے نہیں دیکھتے۔ علم حیاتیات کا ایک ماہر جو صرف جسموں اور نظاموں کو دیکھتا ہے، اسکی نظر میں تمام افرادِ انسان ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن انسان کا مطالعہ کرنے والا ایک فلسفی جو انسان کی حقیقت کو اُس کے ملکات سے اور اس چیز سے جسے انسانیت کہا جاتا ہے وابستہ سمجھتا ہے، وہ یہ باور نہیں کرسکتا کہ انسان کے تمام افراد ایک نوع کے افراد ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ: انسان کے افراد کی تعداد کے مطابق، مختلف انواع موجود ہیں۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ انسانی اقدار، بالقوہ اقدار ہیں۔ بعض افرادِ انسان اس حقیقی اور واقعی انسان کے مقام تک پہنچتے ہیں اور بہت سے افرادِ انسان اُس حقیقی انسان کے مقام تک نہیں پہنچتے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے الفاظ میں: اَلصُّورَةُ صُورَةُ إِنسَانٍ وَ الْقَلْبُ قَلْبُ حَيَوَانٍ. (۱)

یعنی شکل تو انسانی شکل ہے، لیکن اس کا باطن ایک درندے کا باطن ہے، ایک چیتے کا باطن ہے،

۱۔ صورت تو انسان کی سی ہے لیکن دل حیوانوں کا سا۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۵)

ایک سور کا باطن ہے، ایک شیر کا باطن ہے، ایک بھیڑیے کا باطن ہے۔ لیکن یہ کہ باطن بھی ظاہر کے مطابق ہو، یعنی واقعاً انسان ہو، یہ تمام افرادِ انسان میں نہیں ہوتا۔

اگوسٹ کانٹ اور "دین انسانیت"

ہم نے کہا کہ دنیا ایک بار پھر بڑی حد تک مکتبِ انسانیت کی طرف لوٹ آئی ہے۔ یعنی دنیا میں انسانی فلسفوں کے نام سے فلسفے وجود میں آئے ہیں، اور شاید ان میں سب سے زیادہ تعجب انگیز وہ دین انسانیت ہے جسے اگوسٹ کانٹ نے انیسویں صدی کے اواسط میں ایجاد و اختراع کیا اور جس کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ شخص ایک طرف سے اپنی عقل اور فکر اور دوسری طرف سے اپنے دل اور ضمیر کے درمیان ایک عجیب بندگلی میں جا پھنسا تھا۔ اسی وجہ سے اُس نے "دین انسانیت" کے نام سے ایک چیز ایجاد کی اور کہا کہ: انسان کے لئے دین ضروری ہے، اور معاشرے میں نظر آنے والی تمام برائیوں کی وجہ یہ ہے کہ سماج میں دین کمزور ہو گیا ہے۔ گزشتہ دین (اس کی توجہ ہمیشہ کیتھولک مذہب کی طرف رہی ہے) آج کے انسان کا دین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس نے تین ادوار کی نشاندہی کی تھی: ربانی اور ماورائے طبیعی دور، فلسفی اور تعقلی دور، علمی و تحقیقی اور (خود اس کے بقول) مثبت دور۔

اس کا کہنا تھا کہ: کیتھولک مذہب کا تعلق انسان کے ماورائے طبیعی طرزِ تفکر سے رہا ہے۔ آج کا دور علم کا دور ہے، اور اب انسان ماورائے طبیعی تفکر کو قبول نہیں کرتا۔ کانٹ نے بغیر غیبی بنیاد کے ایک دین ایجاد کیا (بہت ہی عجیب بات ہے، دین، دین بھی ہو اور غیبی بنیاد کے بغیر بھی!) لیکن اُس نے اُن تمام آداب و رسوم، مناسک و شعائر اور دین میں موجود تمام آداب کو قبول کیا۔ حتیٰ اپنے دین کے لئے پادری کا بھی قائل ہوگیا۔ وہ خود بھی ایک نبی البتہ بغیر خدا کے نبی بن گیا۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ: اُس نے اپنے آداب کیتھولک مذہب سے لئے۔ ہو بہو کیتھولک مذہب کے آداب و مناسک کو اپنے دین انسانیت میں لے آیا ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تھے، کہتے تھے: ہمیں ایسے دین کی ضرورت نہیں جس کی

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بنیاد خدائی نہ ہو۔ تم جو کیتھولک مذہب کو قبول نہیں کرتے' تم کیوں ان آداب کو جو ممکن ہے ایک عالم کی نظر میں خرافات ہوں' {اپنے دین میں} لے آئے ہو؟ تم خدا کا تو انکار کرتے ہو لیکن اس کے آداب اور اس کے مناسک کو قبول کرتے ہو؟!

لیکن ایک اعتبار سے وہ حق بجانب تھا۔ انسان کو عبادات اور پرستش کی ضرورت ہے' اُسے کچھ آداب و عادات کی ضرورت ہے' جنہیں وہ ایک دوسرے مفہوم اور عنوان سے انجام (۱) دے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے لوگوں کے سامنے ایک ایسا دین پیش کیا جس میں غیبی بنیاد نہیں تھی لیکن عبادات' آداب و عادات اور مناسک و شعائر تھے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ اس شخص نے یورپ اور امریکہ میں بہت سے پیروکار بھی پیدا کر لئے تھے اور حتیٰ لکھا گیا ہے کہ آج بھی اس کے دین کے بہت سے پیروکار موجود ہیں اور اس کا گھر اس کے پیروکاروں کے لئے کعبے کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے ایک عربی کتاب میں پڑھا ہے کہ اُس کی ایک محبوبہ بھی تھی' اور واقعہ کچھ یوں ہے کہ اس عورت کے شوہر کو عمر قید ہو گئی جس کے بعد اُسے اس عورت سے عشق ہو جاتا ہے لیکن وصال سے قبل ہی وہ عورت مر جاتی ہے' اور آخر عمر تک وہ اسے بھلا نہیں پایا۔ اور کہتے ہیں کہ: دراصل اسی مقام سے اُس نے عقل کی دنیا سے دل اور احساسات کی دنیا کا رُخ کیا تھا اور اس کے بعد بالآخر اس نے دین انسانیت ایجاد کیا۔ اس کتاب میں لکھا تھا کہ اس کے پیروکار اس کی محبوبہ کو اس دین کی حضرت مریم کہتے ہیں۔ یعنی جس قدر عیسائی حضرت مریم کے لئے تقدس اور احترام کے قائل ہیں' اگوسٹ کے مکتب انسانیت کے پیروکار اس کی محبوبہ کے لئے اتنے ہی تقدس اور اصطلاحاً قدسیت کے قائل ہیں۔

لیکن بعد کے زمانوں میں مکتب انسانیت کا مسئلہ اور بالفاظ دیگر اصالت بشر کا مسئلہ دوسری شکلوں میں سامنے آیا ہے' جسے آج آپ خود دیکھتے ہیں' خود پڑھتے ہیں اور خود سنتے ہیں۔ کیونکہ ساری باتیں ایک ہی تقریر میں خلاصے کے طور پر پیش کرنی ہیں' لہٰذا بعض حصوں کو خلاصے اور

۱۔ یہاں کیسٹ سے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

http://fb.com/ranajabirabbas

اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔ انسان اور اصالت انسان کے بارے میں بہت زیادہ مسائل ہیں۔ کم از کم سوال کی صورت میں انہیں پیش کرتا ہوں۔

انسان کا اختیار اور ذمے داری

انسان کے بارے میں اُٹھائے جانے والے سوالات میں' انسان کی آزادی اور اختیار اور انسان کی ذمے داری اور فریضے کا مسئلہ بھی ہے۔

کیا انسان واقعاً ایک آزاد اور خود مختار مخلوق ہے؟

اور کیا اُس کی کوئی ذمے داری ہے؟

کیا اُس کا کوئی فریضہ ہے' جسے اُسے انجام دینا چاہیے؟

البتہ اگر آپ {ان سوالوں کے} جواب اسلامی منطق کے نکتۂ نظر سے چاہیں' تو ہمیں کہنا چاہیے کہ سو فیصد ایسا ہی ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ انسان کے نام سے ایک سورہ ہے' جسے سورۂ دہر بھی کہتے ہیں' اور اس کا نام سورۂ انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس سورے کی ابتداء میں انسان کا نام لیا گیا ہے اور انسان کے اختیار' آزادی' فریضے اور ذمے داری کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ سورہ ان آیات سے شروع ہوتا ہے:

"هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـئًا مَّذْكُوْرًا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا" (۱)

لہٰذا انسان خالق کائنات اور اس نظام کے مقابل ایک مجبور وجود نہیں ہے۔

۱۔ یقیناً انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا۔ یقیناً ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا کیا ہے' تاکہ اس کا امتحان لیں' اور پھر اسے سماعت اور بصارت والا بنا دیا ہے۔ یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دیدی ہے' چاہے تو وہ شکر گزار ہو جائے یا کفرانِ نعمت کرنے والا ہو جائے۔ (سورۂ دہر ۷۶۔ آیت ۱ تا ۳)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

خالق کائنات نے اس سے کیا چاہا ہے؟ اس سے آزادی چاہی ہے' اسے ایک آزاد موجود کی صورت میں پیدا کیا ہے' ایک ذمے دار موجود کی صورت میں' ایک ایسے موجود کی صورت میں جس پر ایک فریضہ عائد ہوتا ہے۔ حتیٰ {انسان کے لئے} عظیم ترین تعبیر کہ آپ اس سے بڑی تعبیر تلاش ہی نہیں کر سکتے' وہ تعبیر ہے جو قرآن نے انسان کے بارے میں بیان کی ہے' ارشاد ہوتا ہے: خَلِيفَةُ اللّٰه. خدا کا جانشین۔ قطعی طور پر کسی کتاب نے قرآن کی مانند انسان کی تمجید و تقدیس نہیں کی ہے۔ کہتا ہے: ہم نے انسان کی خلقت کے آغاز میں فرشتوں میں یہ اعلان کیا کہ: اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً. (۱) میں زمین میں جانشین پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر فرشتوں نے اعتراض اور سوال کیا۔ خدا نے اُن سے کہا کہ: میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

روئے زمین پر خدا۔ (جب ہم کہتے ہیں نصف خدا' تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں)

یہ کس بات کی نشاندہی کرتی ہے؟ اُن بے انتہا صلاحیتوں کی جو اس مخلوق میں موجود ہیں۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. (۲) دیکھیے اسلام (جو خود فلسفی پہلوؤں کے اعتبار سے ایک مکتبِ انسانیت ہے) انسان کے لئے کس مقام کا قائل ہے! ایک رمز آمیز صورت میں کہتا ہے: تمام "اسماء" کو جاننا (ایک چیز کے اسم سے مراد اس چیز کو پہچاننے کی کنجی) تمام چیزوں کو پہچاننے کی کلید (key) ہم نے اسے سکھا دی ہے۔ اس کے بعد عالمِ بالا کے فرشتوں کو اس انسان کے مقابلے میں لے آیا۔ انسان فرشتوں پر کامیاب ہو گیا۔ پھر ان سے کہا: اے فرشتو! کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟ تم نے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھا تھا' لہٰذا کہنے لگے کہ: یہ مخلوق کیونکہ شہوت اور غضب کی مالک ہے' اس لئے خونریزی کی مرتکب ہوگی' انسانوں کا قتل اور تباہی پھیلائے گی۔ لیکن تم نے تصویر کا یہ رُخ نہیں دیکھا تھا۔ سب نے اعتراف کیا کہ: سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا. (۳) بارِالٰہا! ہم اعتراف کرتے

۱۔ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰)

۲۔ اور خدا نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۱)

۳۔ ... ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۲)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں کہ ہم نہیں جانتے' ہم صرف وہ جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ یہ ہماری جہالت تھی جو ہم نے وہ باتیں کہیں۔ اس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا: اس مخلوق کے حضور جھکو اور سجدہ کرو: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ. (۱) بہر حال انسان (۲) کے لئے فریضے' آزادی اور اختیار کا قائل ہونے کے نکتۂ نظر سے عظیم ترین تعبیر یہی ہے کہ اسے خدا کا خلیفہ اور جانشین سمجھا گیا ہے' وجود و ہستی کا تکمیل کنندہ سمجھا گیا ہے۔ میں خدا' جو خود خالق ہوں' میں نے اپنی خلاقیت کا کچھ حصہ تجھے تفویض کر دیا ہے' تیرے ذمے کر دیا ہے' تجھے اسے انجام دینا ہے' تو میری خلاقیت اور فعالیت کا مظہر ہے۔

انسان کی سعادت اور لذت

انسان کے بارے میں ایک اور مسئلہ' انسان کی سعادت اور لذت کا مسئلہ ہے۔ اسے بھی ہم سرسری طور پر اور اشارتاً بیان کرتے ہیں:

انسان لذت کا متلاشی رہتا ہے۔

فطرتاً اسے لذتوں کو کہاں تلاش کرنا چاہیے؟

کیا لذت کو اپنے باہر تلاش کرے یا اندر' یا باہر بھی اور اندر بھی اور کس نسبت سے؟

بہت سے لوگ جو لذت کا مرکز اپنے وجود سے باہر تلاش کرتے ہیں اور مسلسل اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنے بیرونی زندگی سے لذت اٹھائیں' یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک انسان کے طور پر نہیں پہچانتے۔ یعنی اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ لذت اور نشاط (جو خود انسان کے اندر سے اٹھتی ہے) کے اصل مرکز وہ خود ہیں۔

۱۔ جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۴)

۲۔ یعنی آپ کیوں فرشتوں کو اس دنیا کی قوت سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں؟! کسی اور چیز سے کیوں تعبیر نہیں کرتے؟ ہم کہتے ہیں کہ فرشتے ایسی موجودات ہیں کہ اس دنیا کی ...

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

کیف وسرور کو کہاں تلاش کرتا ہے؟ شراب کے جام میں' شراب خانے میں۔

کیا خوب کہا ہے مولانا روم نے اس شخص کی داستان میں' جو ایک شراب خور کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے۔ اس نے شرابی کو مخاطب کر کے کہا:

ای ہمہ ہستی چہ می جوئی عدم　　وی ہمہ دریا چہ خواہی کردنم

تو خوشی و خوب و کان ہر خوشی　　تو چرا خود منت بادہ کشی(۱)

یہاں تک کہ کہتے ہیں: "جوہراست انسان و چرخ او را عرض" (انسان جوہر ہے اور پوری کائنات اس کا عرض) ان کے اس طرح کے دوسرے اشعار بھی ہیں۔

البتہ یہ کہ انسان تمام خارجی چیزوں کو مکمل طور پر ترک کر دے' اور ہندوستان کے افراطی مکتب کا پیروکار بن کر یہ کہے کہ بنیادی طور پر ہر لذت کو خود اپنے اندر ہی تلاش کرنا چاہیے' درست نہیں ہے۔ شاید مولانا روم کے بعض اشعار میں یہ مبالغہ ہو' مثلاً وہاں جہاں وہ کہتے ہیں کہ:

راہ لذت از درون دان نز برون　　احمقی دان جستن از قصر و حصون

آن یکی در کنج زندان مست وشاد　　وآن یکی در باغ ترش وبی مراد(۲)

ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خارجی اشیا کو چھوڑ دو۔ ان کی مراد یہ ہے کہ انسان اگر لذت کا حصول چاہتا ہے' تو اسے یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ تمام لذتوں کو اپنی ذات سے باہر کی مادیات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لذت کا اصل مرکز خود اس کے وجود میں موجود ہے' یا کم از کم ان دونوں کے درمیان ایک توازن برقرار ہونا چاہیے۔

انسان کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں' جنہیں ہم مختصر طور پر عرض کریں گے۔ وہ مکتب جو اپنے آپ کو مکتبِ انسانیت سمجھتا ہے' اسے لازماً چند سوالات کے جواب دینا چاہئیں۔ اگر

۱۔ اے وہ ذات جو مکمل ہستی ہے تو کیوں عدم کی تلاش میں ہے؟! اے وہ ذات جو مکمل دریا ہے تو کیا کرنا چاہتا ہے؟! تو خود خوشی ہے' تو خود خوبی ہے' تو ہر خوشی کا مرکز ہے۔ تو کیوں شراب کا احسان لیتا ہے؟!

۲۔ یعنی لذت کا راستہ اندر سے سمجھو نہ کہ باہر سے۔ اسے محلوں اور قلعوں میں تلاش کرنا حماقت سمجھو۔ ایک تو قید خانہ میں بھی خوش [illegible] اور دوسرا باغ میں بھی مایوس اور نامراد ہے۔

اُس نے ان سوالات کے جواب دیئے' تو پھر وہ صحیح معنوں میں ایک مکتبِ انسانیت ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا' انسان معنوی دنیا کا دریچہ اور دروازہ تھا۔ بشر نے اپنے وجود ہی سے معنوی دنیا کو پہچانا تھا۔ معنویت اور انسانیت' دین اور انسانیت دو جدا نہ ہو سکنے والے امور ہیں۔ یعنی یا تو ہم دین اور انسانیت' دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیں' یا اگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ملحق ہونا چاہیں' تو لازماً ہمیں دوسرے کے ساتھ بھی ملحق ہونا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دین سے ملحق ہو جائیں اور انسانیت کو' انسانیت کے تقدس کو چھوڑ دیں' اُسی طرح جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت سے ملحق ہو جائیں اور دین کو چھوڑ دیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں' ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

انسانیت کی اصالت کے بارے میں مکاتیب کے درمیان تضاد

وہ تناقض اور تضاد جس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ انسانیت کی اصالت کے قائل مکاتیب میں پایا جاتا ہے' وہ یہی ہے۔

ماضی میں انسانیت کے زوال کی بنیاد یہی ہے' البتہ یہ زوال غلط بھی تھا۔ یعنی بطلیموسی ہیئت میں تبدیلی کو اس بات کا سبب نہیں بننا چاہیے تھا کہ ہم اس لحاظ سے کہ انسان تخلیق کا مقصد ہے' انسان کے عظیم مقام کے بارے میں شک کرنے لگیں۔ زمین کائنات کا مرکز ہو یا نہ ہو' انسان کائنات کا مقصد ہے۔ یعنی طبیعت (nature) اپنے تکامل کے راستے میں اسی جانب گامزن ہے' خواہ انسان کو ہم ایک براہِ راست مخلوق سمجھیں یا اسے دوسرے حیوانات کی نسل سے قرار دیں۔ اس سے اس بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم اسے روحِ خدائی کا حامل سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ خدا نے فرمایا ہے: نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ. اس نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ انسان خدا کی نسل سے پیدا ہوا ہے۔ اگر انسان کے بارے میں مثلاً یہ کہتا کہ: انسان کے مادّے کو' اس کی سرشت کو دوسری دنیا سے لائے اور وہ مٹی جسے دوسری دنیا سے لایا گیا ہے اس کی بنا پر وہ ایک عظیم اور مقدس موجود بنا ہے (جدید علمی نظریات' جیسے اصولِ تکامل اس میں شک وشبہ پیدا کر سکتے ہیں)

Contact :-jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

اے وہ لوگو جن کا فلسفہ انسان دوستی کا فلسفہ ہے' اور جن کے ایمان کا محور انسانیت ہے' ہم پوچھتے ہیں کہ: کیا انسان میں احسان' نیکی اور خدمت نام کا کوئی جذبہ موجود ہے یا نہیں؟

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ: ہرگز اس میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے' تو پھر انسان کو انہیں انجام دینے کی دعوت دینا بھی غلط ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی پتھر یا حیوان کو اس بات کی دعوت دے رہے ہوں!

نہیں' ایسا جذبہ موجود ہے۔

لیکن یہ جو ہے' یہ کیا ہے؟

ممکن ہے کوئی کہے کہ: ہمارے اندر موجود دوسروں کی خدمت گزاری کا جذبہ ایک قسم کی جانشین سازی ہے۔ جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً (کچھ لوگ تعلیم سے محروم ہیں) ۔۔۔(۱) اور ہمارے اپنے خیال میں ہمارے اندر انسان دوستی کا جذبہ تقویت پاتا ہے کہ ہم جائیں اور انہیں تعلیم دیں' ان کی خدمت کریں' چلیں مظلوموں کو نجات دلائیں۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اچھی طرح غور و فکر کریں تو دیکھیں گے کہ انسان نے اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ لیا ہے۔ پہلے سوچتا ہے کہ انہیں اپنے طبقے میں رکھے اور اپنے آپ کو ان کے طبقے میں سمجھے' پھر اس بات کو مدنظر رکھتا ہے کہ اب وہ خود ان کی جگہ پر ہے۔ اس کے بعد وہی خود پرستی کی حس کہ اپنا دفاع کرنا چاہئے' یہاں مظلوم کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ورنہ انسان میں ایک مظلوم کے دفاع کے لئے اصالت کی حامل کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

مکتبِ انسانیت کو جواب دینا چاہئے کہ:

اولاً' ایسا کوئی جذبہ ہے بھی یا نہیں؟

انسان میں ایسی کوئی بزرگواری پائی بھی جاتی ہے یا نہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ پائی جاتی ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا (۲) کیونکہ انسان خلیفۃ اللہ

۱۔ کیسٹ میں آواز واضح نہیں ہے۔

۲۔ پھر اسے بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔ (سورہ شمس ۹۱۔ آیت ۸)

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہے' جود و کرمِ الٰہی کا مظہر ہے' لہٰذا مظہرِ احسان ہے۔ یعنی انسان حالانکہ خودخواہ ہے اور اس کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے وجود اور حیات کی حفاظت اور بقا کی خاطر اپنے لئے کوشش کرے' لیکن اس کا پورا وجود خودخواہ نہیں ہے' (اس میں دوسروں کے لئے) خیر خواہی بھی پائی جاتی ہے' دنیا کی تعمیر کا جذبہ بھی موجود ہے' انسانیت بھی ہے' اخلاقی ضمیر بھی ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے' جب میں شیراز میں تھا' تو مجھے "موسسہ' خوشحالان" کے نام سے ایک ادارے کے بارے میں بتایا گیا۔ کچھ افراد نے صرف اپنے اندرونی جذبے اور ذاتی ایمان کی بنیاد پر ایک ادارہ بنایا ہے اور اس میں کچھ گونگوں' بہروں کو جمع کیا ہے۔ میں نے جا کر وہاں ان کی ایک کلاس کا دورہ کیا۔ واقعاً ہم جیسے اصطلاحاً انتہائی نازک مزاج لوگوں کے لئے کچھ دیر کے لئے بھی اس کلاس میں جانا اور اسے دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ انسان جب ایسے بچوں کو دیکھتا ہے کہ جب وہ اشارے کے ذریعے ایک لفظ بولنا چاہتے ہیں' تو اپنا دہان ٹیڑھا کرتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا' جو سید بھی تھے' اور اتفاقاً اُن کا نام بھی امامزادہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صاحب کس قدر خلوص' کیسے عشق اور جذبے کے ساتھ (باوجود یہ کہ مجھے وہیں سے پتا چلا کہ وہ جو تنخواہ لیتے ہیں وہ تنخواہ ایک عام اسکول ٹیچر کی تنخواہ سے بھی کم ہے' کیونکہ اس ادارے کے پاس فنڈ نہیں ہیں) لوگوں کے گونگے' بہرے بچوں کو کس قدر مشکلوں سے لکھنا سکھا رہے ہیں' اور ساتھ ساتھ انہیں کس مشکل سے حروف کے معنی سمجھا رہے ہیں۔ مثلاً جب وہ کہنا چاہتے تھے کہ "یہاں" تو اپنے دہان کو اس طرح ٹیڑھا کرتے تھے' کہ بچے اُن کا چہرہ دیکھ کر سمجھ لیتے کہ وہ "یہاں" کہہ رہے ہیں' اور وہ فوراً تختۂ سیاہ پر "یہاں" لکھ دیا کرتے۔ اسی طرح کی اور چیزیں بھی تھیں۔

انسان میں یہ کیا چیز ہے؟

اُس کے اندر یہ کیسا جذبہ ہے؟

یہ چیز مظہرِ انسانیت اور اصالتِ انسانیت کو نمایاں کرتی ہے۔

مجموعی طور پر نیک لوگوں کے بارے میں تحسین کی حس اور بُرے لوگوں کے حوالے سے نفرت کا جذبہ' اگرچہ ان لوگوں کا تعلق گزشتہ زمانوں [illegible] کیا ہے؟

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

جب یزید اور شمر کا نام ان کے انجام دیئے ہوئے مظالم کے ساتھ ہمارے سامنے لیا جاتا ہے اور دوسری طرف شہدائے کربلا کا ان کی قربانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ذکر کیا جاتا ہے' تو ہم خود اپنے اندر پہلے گروہ کے لئے نفرت کے جذبات اور دوسرے گروہ کے لئے احترام و عقیدت کے جذبات محسوس کرتے ہیں۔

آخر یہ کیا ہے؟

کیا واقعاً یہاں بھی طبقے کا مسئلہ ہے' ہم سوچتے ہیں' اپنے آپ کو شہیدان کربلا کے طبقے میں سمجھتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو اس دوسرے گروہ کا حصہ سمجھتے ہیں' اور یزید اور شمر کے بارے میں نفرت کا جذبہ وہی جذبۂ نفرت ہے جو ہم اپنے دشمنوں کے بارے میں رکھتے ہیں' جو ہمیں اُن کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اور احترام کا وہ جذبہ جو ہم شہیدان کربلا کے بارے میں رکھتے ہیں' یہ وہی تمایل ہے جو ہم خود اپنے بارے میں رکھتے ہیں' اور اُس کا اظہار ہم اس طرح کرتے ہیں؟!

اگر ایسا ہے' تو پھر وہ جسے آپ اپنا دشمن اور اپنے اعتبار سے ظالم سمجھتے ہیں' وہ آپ سے بالکل مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ (اس طرزِ تفکر کے مطابق) اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ مثلاً یزید اور شمر کی تعریف کرے اور ان کا احترام کرے اور شہیدان کربلا سے (نعوذ باللہ) نفرت کرے۔ کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو اپنے طبقے والوں کے ساتھ رکھتا ہے اور جس جذبے کی وجہ سے آپ نے پہلے گروہ سے نفرت کی ہے اور دوسرے گروہ کی تعریف کرتے ہیں' وہ اس کے برعکس جس سے آپ کو نفرت ہے اسکی تعریف کرتا ہے اور جس کی آپ تعریف کرتے ہیں اُس سے نفرت کرتا ہے۔

اس طرح نہیں ہے۔ آپ یہاں ایک دوسرے دریچے سے (موضوع کو دیکھتے ہیں)' جو انفرادی دریچہ نہیں ہے' ذاتی دریچہ نہیں ہے' بلکہ انسانیت کا دریچہ ہے اور دنیائے انسانیت اور دریائے انسانیت کے ساتھ آپ کو متصل کرتا ہے۔ اس نکتۂ نظر میں پھر "میں" اور "تنفر" نہیں بلکہ حقیقت کا دخل ہوتا ہے۔ اُس تعلق میں جو آپ وہاں رکھتے ہیں' وہ "میں" جو شہیدان کربلا کو خراج تحسین پیش کرتی ہے اور ان کے دشمنوں سے نفرت کرتی ہے' وہ انفرادی "میں" نہیں ہے' بلکہ ایک کلی اور نوعی "میں" ہے۔

مکتب انسانیت جو بشریت کے لئے اصالت کا قائل ہے' اسے اس سوال کا جواب دینا چاہئے کہ یہ چیزیں کیا ہیں اور کہاں سے پیدا ہوتی ہیں؟ اور اسی طرح دوسرے مسائل' جیسے انسان شکرگزاری سے سچا عشق رکھتا ہے۔ انسان اس شخص کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے' جس نے اس کے ساتھ نیکی کی ہو۔ یہ خود ایک مسئلہ ہے۔ جب بھی انسانی اقدار کو اصالت ملی' اس وقت خود انسان کا مسئلہ درمیان میں آتا ہے۔ صرف اشارہ کرتے ہیں:

یہ انسان جس میں ایسی اصالتیں موجود ہیں' کیا اس کے تار و پود وہی ہیں جو مادیت بتاتی ہے' ایک مشین ہے؟ ایک اپالو ہے؟

مشین جتنی بھی بڑی ہو' صرف بڑی ہوگی۔ اگر ایک مشین اپالو سے ہزار گنا بڑی بھی بنائی جائے' تو اس کے بارے میں کیا کہنا چاہئے؟ یہی کہنا چاہئے کہ عظیم ہے' حیرت انگیز ہے' غیر معمولی ہے۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بزرگوار ہے؟ نہیں۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقدس ہے؟ نہیں۔ اگر موجودہ اپالو سے ایک ارب گنا بڑی مشین ہو اور اربوں پرزے اس میں استعمال ہوئے ہوں' تب بھی وہ ایک عظیم' حیرت انگیز اور غیر معمولی چیز ہے۔ کسی صورت ممکن نہیں کہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اسے بزرگوار' مقدس اور قابل احترام کہا جا سکے۔

انسانی حقوق کا چارٹر اور اسی طرح کمیونسٹ فلاسفر وہ لوگ جو مختلف شکلوں میں اصالت انسان کے طرفدار ہیں' وہ انسان کے اندر نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کے قائل ہوئے بغیر کس طرح انسان کے تقدس اور حیثیت کا دم بھر سکتے ہیں؟ جب اقدار کی یہ اصالت ان پر واضح ہوگی' تب خود انسان کی اصالت ان کے لئے واضح ہو جائے گی۔

اب جبکہ ہم خود انسان کی اصالت تک پہنچ گئے ہیں' تو ایک اور سوال کو مختصراً عرض کرتے ہیں:

انسان کی اصالت کا خدا کے ساتھ تعلق

ہم انسانی اقدار کی اصالت سے' خود انسان کی اصالت تک پہنچے۔ (نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ)

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بے کنار تاریکی کے درمیان واقع اس دنیا میں کیا صرف یہی انسان ہے؟ اور ایک یورپین کے بقول زہر کے ایک سمندر کے درمیان اتفاقاً صرف یہی صاحب میٹھے پانی کا ایک قطرہ پیدا ہوئے ہیں؟ یا نہیں' یہ میٹھا قطرہ میٹھے سمندر کا نمائندہ ہے؟ نور کا یہ ذرہ دنیائے نور کا نمائندہ ہے؟

یہ وہ مقام ہے جہاں اصالتِ انسان کا خدا کے ساتھ تعلق واضح ہوتا ہے۔ یعنی بنیادی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے' اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْض (۱) اگر آپ کہتے ہیں خدا' تو خدا صرف یہ نہیں ہے کہ (جو عالمِ طبیعت کا مبدا ہے)۔۔(۲) ہم ارسطو کے محرکِ اوّل کا ذکر نہیں کر رہے' ارسطو کا محرکِ اوّل اسلام کے خدا کے سوا کوئی اور چیز ہے۔ وہ کائنات سے جدا اور ایک اجنبی موجود ہے۔ اسلام کے خدا (سے مراد ہے): هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ (۳) جوں ہی آپ خدا کہتے ہیں' یکلخت دنیا آپ کے سامنے ایک نیا منظر پیدا کر لیتی ہے۔ اُن تمام اصالتوں کو جو آپ اپنے وجود میں محسوس کرتے ہیں' معنی و مفہوم مل جاتے ہیں ہدف مل جاتا ہے۔ آپ جان لیتے ہیں کہ اگر آپ نور کا ایک ذرہ ہیں' تو اسلئے کہ نور کی ایک دنیا موجود ہے۔ اگر ایک میٹھا قطرہ ہیں' تو اس لئے کہ میٹھے پانی کا ایک بے کنار سمندر موجود ہے۔ جس کا ایک جلوہ آپ کی روح میں ہے۔

اسلام ایک انسانی مکتب ہے' یعنی انسانی معیاروں پر مبنی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو غلط امتیازات کی وجہ سے انسانوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں' وہ اسلام میں نہیں ہیں۔۔ یعنی اسلام میں کوئی ملک نہیں ہے' نسل نہیں ہے' خون نہیں ہے' علاقہ نہیں ہے' زبان نہیں ہے۔ یہ چیزیں کبھی بھی اسلام میں انسانوں کے امتیاز کا معیار نہیں رہیں۔ اسلام میں جو باتیں انسانوں کے امتیاز کا معیار ہیں' وہ وہی انسانی اقدار ہیں۔

اسلام جو ایک مکتبِ انسانیت ہے اور انسانیت کے لئے احترام کا قائل ہے' وہ اس بنیاد پر

۱۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۵)

۲۔ یہاں کیسٹ میں آواز صاف نہیں ہے۔

۳۔ [illegible]۔ (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۳)

http://fb.com/ranajabirabbas

انسانی اقدار کے لئے اصالت کا قائل ہے کہ خود انسان کے لئے اصالت کا قائل ہے۔ اور خود انسان کے لئے اس اعتبار سے اصالت کا قائل ہے کہ کائنات کے لئے اصالت کا قائل ہے۔ یعنی خداوندِ قادر و متعال کا قائل اور اس کا معترف ہے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ. (۱) اور یہی وجہ ہے کہ واحد ایک مکتبِ انسانیت جو ایک صحیح منطق کی بنیاد پر موجود ہو سکتا ہے اسلام ہے' اس کے علاوہ دنیا میں کوئی مکتبِ انسانیت موجود نہیں ہے۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ.

☆......☆......☆

۱۔ وہ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' وہ بادشاہ' پاکیزہ صفات' بے عیب' امان دینے والا' نگرانی کرنے والا' صاحبِ عزت' زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔ (سورۂ حشر ۵۹۔ آیت ۲۳)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

التماس سورۃ الفاتحہ

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوذر شہرت بلگرامی ابن سید حسن رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ اُمّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان

و جملہ شہداء و مرحومین ملت جعفریہ

طالبانِ دعا

سید حسن علی نقوی ، حسّان ضیاء خان

سعد شمیم ، حافظ محمد علی جعفری

اللھم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجھم

Hassan

naqviz@live.com

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas